تحکیم اور جرگہ

تعارف واہمیت، طریقۂ کار اور متعلقہ فقہی مسائل

مؤلف:

حضرت مولانا مفتی عبید الرحمٰن صاحب، مردان

مکتبہ دار التقویٰ، مردان

adilraza.ar28@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب اول: تحکیم کا تعارف و شرائط

تحکیم کا تعارف

اس کا لغوی معنی ہے : کسی کو حاکم، ثالث بنانا۔کسی کو فیصلہ کرنے اور حکم چلانے کے لئے مقرر کرنا۔فقہ کی اصطلاح میں بھی یہ لفظ تقریبا اسی معنیٰ میں استعمال ہوتاہے، چنانچہ "بحر "میں ہے:

وأما في الاصطلاح فهو تولية الخصمين حاكما يحكم بينهما[1]

ترجمہ: اصطلاح میں فریقین کا ایک ایسے شخص کو ثالث اور حکم مقرر کرنا جو ان کے درمیان فیصلہ کرے۔

تحکیم کے اطراف

تحکیم کے لئے درج ذیل چار چیزیں ضروری ہیں:

۱: فریقین: جو کسی کو اپنے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے متعین کرتے ہیں اور اس کو اختیار دیتے ہیں کہ ان کے درمیان فیصلہ کرے۔عربی میں ان کو محکِم کہا جاتا ہے۔

۲: ثالث: وہ شخص جس کو فریقین اپنے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے متعین کرتے ہیں، اس کو "محکَم "، "ثالث "اور بعض اوقات حکم بھی کہا جاتا ہے۔

۳: نزاع و حادثہ: وہ حل طلب قضیہ جس میں فریقین کا باہم اختلاف ہو، اس کو "محکوم فیہ "سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

---

[1] البحرالرئق: کتاب القضاء، باب التحکیم، ج7،ص24.

۴:فیصلہ: ثالث کو اختیار ملنے کے بعد وہ دونوں فریق کے درمیان فیصلہ کرتا ہے،اس کو "حکم" کہا جاتا ہے۔

تحکیم کی مشروعیت

کسی چیز کے مشروع ہونے کے لئے شریعت کے چار دلائل میں سے کسی ایک سے ثابت ہونا کافی ہوتا ہے، لیکن تحکیم کی مشروعیت اور جواز چاروں دلائل سے ثابت ہوتا ہے، جس کا مختصر بیان یہ ہے:

الف: قرآن کریم نے زوجین میں اختلاف کے وقت اتفاق پیدا کرنے کے لئے حکم بنانے کا حکم دیا ہے، چنانچہ سورۃ نساء آیت رقم پینتیس میں ہے:

{ وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِنْ أَهْلِهَا إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا } [النساء: 35]

ترجمہ: ورا گرتمہیں کہیں میاں بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا خطرہ ہو تو ایک منصف مرد کے خاندان میں سے اورا یک منصف عورت کے خاندان میں سے مقرر کرو اگر یہ دونوں صلح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان دونوں میں موافقت کر دے گا

ب: حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے خود غزوہ بنی قریظہ کے موقع پر حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو حکم ٹھہرایا تھا۔حضرت ابو شریح ہانی بن یزید وغیرہ کے فیصلوں پر نہ صرف خاموشی بلکہ بعض اوقات تحسین بھی فرمائی تھی۔حضرات صحابہ کرام نے بھی مختلف مواقع پر ایک دوسرے کو حکم بنایا اور اس کے بعد فیصلہ پر عمل در آمد فرمایا۔

ج: تحکیم کے جائز ہونے پر اہل علم کا اتفاق رہا ہے، سلف و خلف میں سے کسی مستند عالم سے اس کا انکار ثابت نہیں ہے۔

د: قضاء پر قیاس کرتے ہوئے بھی اس کا جائز ہونا ہی معلوم ہوتا ہے، دونوں جھگڑوں کے ختم کرنے اور تنازع کے رفع کرنے کے طریقے ہیں۔

تحکیم کا شرعی حکم

تحکیم فی نفسہ ایک جائز اور مباح کام ہے، کوئی فرض یا واجب نہیں ہے اور ممنوع وحرام بھی نہیں ہے۔ فقہی کتابوں میں عام طور پر اسی حیثیت کے ساتھ اس کی تفصیل ذکر کی جاتی ہے، تاہم یہ تحکیم کا فی نفسہ حکم ہے، بعض خارجی عوامل کی وجہ سے اس کے حکم میں تغیر بھی آسکتا ہے، چنانچہ باہمی جنگ جھگڑوں کا ختم کرنا شرعا ضروری ہے اور یہ بھی لازم ہے کہ جھگڑوں کے رفع کرنے کا طریقہ شرعی تعلیمات کے مطابق ہو، اس کے لئے سب سے مفید، قابل عمل اور مؤثر ذریعہ تو شرعی نظامِ قضاء ہی ہے، اگر کہیں ایسا نظام قائم ہو تو ظاہر ہے کہ وہاں قضاء کے علاوہ تحکیم مباح ہی ہوگی کہ وہ شرعی نظام قضاء کی طرح مؤثر راستہ نہیں ہے اور اصل دینی ذمہ داری (لوگوں کے نزاعات کا تصفیہ) اسی نظام سے اچھی طرح حاصل کی جاسکتی ہے، البتہ جہاں کوئی علاقہ/ملک اس نظام قضاء کی نعمت سے محروم ہو، کہ یا تو وہاں سرے سے کوئی نظام قضاء ہی موجود نہ ہو یا نظام تو موجود ہو لیکن شرعی تعلیمات کے مطابق نہ ہو جیسا کہ دنیا کے بیشتر ممالک کا یہی حال ہے[1]، تو ایسی صورت میں جہاں

[1] یہ عالم اسلام کے لئے بہت بڑی بدقسمتی اور نہایت محرومی کی بات ہے کہ ہماری ناقص معلومات کے مطابق امارت اسلامیہ افغانستان کے علاوہ کہیں بھی مکمل اسلامی عدالتی نظام قائم نہیں ہے۔ جس زمین پر اشتراکیت جیسی ناسور اور خالص مادیت جیسے خلاف عقل وفطرت نعرے وجذبات نافذ ہو سکتے ہیں، اس کے پیروکار بھرپور قوت وشجاعت کے ساتھ ان جیسے باطل نظامہائے معیشت کو انسانیت کے لئے نعمت باور کرا کر نافذ کر سکتے ہوں، ہزاروں ہی نہیں، لاکھوں افراد کو موت کے گھاٹ اتار کر ان پر یہ نظریات مسلط کر سکتے ہوں، وہاں اسلامی نظام کے نفاذ کے بارے میں شعوری وغیرشعوری طور پر اعذار تلاش کئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کتنے ہی حکیمانہ انداز میں مسلمانوں کی ضمیر کو جھنجھوڑتے ہوئے ارشاد فرمایا:

رفع خصومات اور فصل نزاعات تحکیم کی صورت میں متعین ہو جائے، وہاں یہ صرف جائز ہی نہیں، بلکہ شرعی نقطہ نظر سے ضروری قرار پائے گا۔

حضرات فقہائے کرام تحکیم کو "قضاء" کے ضمن میں ذکر کرتے ہیں اور ان کے زمانے میں نظام قضاء رائج تھا، جزوی خرابیوں کے اعتراف کے باوجود جب تک نظام خلافت برقرار رہا، ساتھ نظام قضاء بھی شرعی تقاضوں کے مطابق کسی نہ کسی درجے میں برقرار رہا، اس لئے اس زمانے میں تحکیم کا وہی حکم تھا جو انہوں نے بیان فرمایا ہے لیکن جس جگہ اس جیسی صورت حال نہ ہو وہاں اسی حکم کا برقرار رہنا ضروری نہیں ہے۔

تحکیم کا رکن

تحکیم کا اصل رکن دو چیزیں ہیں:

الف: فریقین کے وہ الفاظ جن کے ذریعے وہ کسی ثالث کو اپنے درمیان فیصلہ کرنے کا اختیار سونپتے ہیں۔

ب: ثالث کا قبول کرنا۔ اگر ثالث اس سپردگی کو قبول نہ کرے تو بھی وہ حکم نہیں بنے گا اور اس کے فیصلے کو وہ تقدس حاصل نہ ہو گا جو حکم کے فیصلے کو حاصل ہوتا ہے۔ "بحر" میں ہے:

وركنه اللفظ الدال عليه مع قبول الآخر فلو حكما رجلا فلم يقبل لا يجوز حكمه إلا بتجديد التحكيم كذا في المحيط.[1]

{ وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ إِنْ تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا } [النساء: 104]

[1] البحرالرئق: كتاب القضاء، باب التحكيم، ج7، ص24.

ترجمہ: تحکیم کار کن وہ الفاظ ہیں جو ثالث کے قبول کے ساتھ تحکیم پر دلالت کرتے ہیں، پس اگر فریقین نے ایسے شخص کو ثالث بنایا جو انکی سپردگی کو قبول نہ کرے تو اس کا ثالث بنانا جائز نہیں ہے الاّیہ کہ نئے سرے سے اس کو ثالث بنائے۔

تحکیم کی شرائط

جیسا کہ پہلے تحریر کیا گیا ہے تحکیم کے ساتھ چار چیزیں وجود میں آتی ہیں جن کو تحکیم کے اطراف سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، اب تحکیم کا معاملہ درست ہونے کے لئے جن شرائط کی ضرورت ہے، ان میں سے بعض کا تعلق تو ان فریقین کے ساتھ ہے جو کسی کو اختیار دے کر ثالث بناتے ہیں، بعض کا تعلق اسی ثالث کے ساتھ ہے جبکہ بعض کا متعلقہ نزاعی مسئلہ اور بعض کا تعلق ثالث کے فیصلہ کے ساتھ ہے۔ یہاں اختصار کے ساتھ ترتیب وار سب اہم شرائط کو ذکر کیا جاتا ہے۔

فریقین کے لحاظ سے شرائط

فریقین کے اعتبار سے ایک شرط تو یہ ہے کہ وہ دونوں عقل مند ہوں۔ تحکیم کے نتیجہ میں ثالث فریقین کے درمیان فیصلہ کرتا ہے جس میں مادی لحاظ سے فائدہ اور نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے، اور ان جیسے معاملات کے سرانجام دینے کے لئے ضروری ہے کہ کرنے والے عقل و شعور رکھتے ہوں۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ فریقین اپنی رضامندی سے ثالث کو مقرر کریں اور اس کو اپنے درمیان فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیں۔

حکم (ثالث) کے لحاظ سے شرائط

ثالث چونکہ فریقین کے درمیان باقاعدہ فیصلہ کرتا ہے، اس لئے اس میں قاضی کی شرائط کا پایا جانا ضروری ہے اور قاضی کے لئے بنیادی شرط یہی ہے کہ وہ اس میں شرعی نقطہ نظر سے گواہی دینے کی اہلیت وصلاحیت موجود ہو۔ لہٰذا ضروری ہے کہ فریقین کے اختیار سپرد کرتے وقت بھی اور پھر عملی طور پر فیصلہ کرتے وقت بھی ثالث میں درج ذیل شرائط موجود ہوں:

۱ تا ۳: حکم عاقل، بالغ اور آزاد شخص ہو۔

۴: اگر فریقین میں سے کوئی ایک یا دونوں ہی مسلمان ہوں تو حکم کے لئے بھی مسلمان ہونا ضروری ہے کیونکہ حکم کو فریقین پر ولایت حاصل ہوتا ہے جبکہ کافر کو مسلمانوں کے اوپر کوئی ولایت واختیار حاصل نہیں ہے۔

۵: یوں ہی جیسے قاضی کے لئے مناسب یہی ہے کہ وہ عادل ہو، فاسق شخص اس منصب کا اہل نہیں ہے یوں ہی فسق وفجور کا مرتکب شخص ثالث بننے کی لیاقت بھی نہیں رکھتا، اس کو اپنے اختیار سے بلاضرورت ثالث ٹھہرانا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے [1]۔

۶: حکم کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ متعین ہو، غیر متعین شخص کو حکم ٹھہرانا غیر معقول اقدام اور لایعنی بات ہے۔

---

[1] اُس وقت عام صورت حال یہ ہے کہ غیر سرکاری سطح پر باہمی فیصلوں کے لئے عام طور پر ایسے ہی افراد کو متعین کیا جاتا ہے جو جرائم پیشہ، بدمعاش یا خوفناک ودہشت ناک قسم کے لوگ ہوتے ہیں، اس کی عام طور پر یہ وجہ بتائی جاتی ہے کہ انہی جیسے لوگ اپنے فیصلے لوگوں پر نافذ کرواسکتے ہیں، زورِ بازو کے بغیر کسی فیصلہ پر آمادہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ان جیسے مسائل کا اصل علاج یہی ہے کہ لوگوں میں دینی حس کو بیدار وراسخ کیا جائے، ہمارے اکثر مسائل کی جڑ یہی دینی حس کی کمزوری ہی ہے۔

۷:اگر فریقین نے ایک سے زیادہ افراد کو ثالث بنایا ہوں تو ان کا فیصلہ تب نافذ سمجھا جائے گا جبکہ سب باہمی اتفاق سے فیصلہ کریں۔

محلِّ تحکیم کے اعتبار سے شرائط

اس لحاظ سے بنیادی طور پر ایک ہی شرط ہے وہ یہ ہے کہ معاملہ فریقین کے دائرہ اختیار میں داخل ہو۔ لہٰذا جو چیزیں خالص اللہ تعالیٰ ہی کے حقوق ہیں مثال کے طور پر حدّ زنا، سرقہ اور لعان وغیرہ۔ وہاں تحکیم کا اعتبار نہیں ہے۔

فیصلہ کے اعتبار سے شرائط

تحکیم کے معاملہ میں اگر فریقین نے حکم کو شرعی احکام کی روشنی میں فیصلہ کرنے اختیار دیا ہو تو اس کا فیصلہ شرعاً نافذ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ شرعی حدود واحکام کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے فیصلہ کیا ہو۔مثال کے طور پر گواہوں، قسم، نکول (قسم دلانے کے باجود مدعی علیہ کا قسم کھانے سے اعراض یا انکار کرنا) یا مضبوط اور غیر محتمل قرائن کی بنیاد پر فیصلہ کیا ہو۔ مدعی یا مدعی علیہ میں سے جس کے ذمہ جو کچھ لازم کیا ہو، وہ شرعاً بھی ان کے ذمہ لازم ہوتے ہو۔

تحکیم کی فقہی حیثیت

تحکیم کا معاملہ فریقین کی صوابدید پر موقوف ہے، وہ چاہیں تو کسی کو ثالث مقرر کریں اور چاہیں تو ایسا نہ کریں، مقرر کرنے کے بعد بھی جب تک حکم مفوضہ اختیار کے مطابق فیصلہ نہ کرے تب تک دونوں فریق میں سے ہر ایک کو اختیار حاصل ہے کہ چاہے تو اپنا اختیار واپس لے کر ثالث کو معزول کرے اور چاہے تو برقرار رکھے، لیکن فیصلہ انجام پانے

کے بعد دونوں کی شرعی اور اخلاقی ذمہ داری ہے کہ اس فیصلہ کو درست تسلیم کرلیں اور اس کے مطابق نزاع ختم کریں، ورنہ تو گناہ ہوگا۔

"بحر "میں ہے:

وصفته قبل الحكم الجواز وبعده اللزوم [1]

ترجمہ: اس کا فقہی حکم یہ ہے کہ فیصلہ انجام پانے سے پہلے فریقین کے لئے جائز ہیں (چاہے تو اپنا اختیار واپس لے کر ثالث کو معزول کرے اور چاہے تو برقرار رکھے)، لیکن فیصلہ انجام پانے کے بعد دونوں فریق کے لئے فیصلہ کو درست تسلیم کرنا لازم ہیں۔

قاضی اور ثالث کے فیصلہ کا مقارنہ

قاضی اصطلاح میں وہی شخص ہے جس کو حکومت کی طرف سے عہدہ قضاء کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے جبکہ ثالث کو حکومت کی طرف سے کوئی خصوصی اختیار تفویض نہیں ہوتا بلکہ فریقین ہی اپنی حد تک اس کو اختیار دیتے ہیں۔

اتفاقی نکات

دونوں کے کام میں اتفاقی نکات یہ ہیں:

ا: دونوں ہی تنازعات کا فیصلہ کرتے ہیں۔

۲: فیصلہ شریعت کے مطابق ہو تو اس کو ماننا ضروری ہوتا ہے اور بلاوجہ اس سے روگردانی کرنا ناجائز و گناہ ہے۔

---

[1] البحرالرئق: كتاب القضاء، باب التحكيم، ج7، ص25.

۳: دونوں کے لئے اس بات کا لحاظ ضروری ہے کہ تہمت کی جگہوں سے بچتے رہیں، لہذا اپنے اصول (والدین اور ان کے اوپر تک کے والدین)، فروع (اولاد اور ان کی اولاد) اور بیوی کے حق میں کیا ہوا فیصلہ نافذ نہیں ہو گا۔

اختلافی نکات

درج ذیل بعض امور میں دونوں فیصلے مختلف ہو جاتے ہیں:

۱: قاضی کا فیصلہ تمام ان لوگوں پر لاگو ہو گا جن پر فیصلہ کرنے کا اختیار اس کو سپرد کیا گیا ہو جبکہ حکم کا فیصلہ فریقین پر ہی نافذ ہو گا۔ اس کو یوں بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ قاضی کا فیصلہ فریقین کے علاوہ کو بھی متعدی ہوتا ہے جبکہ ثالث کا فیصلہ فریقین کی حد تک ہی محدود ہوتا ہے، ان کے علاوہ کی طرف متعدی نہیں ہوتا۔

۲: تمام اتفاقی اور اجتہادی مسائل میں قضائے قاضی کا سہارا لینا درست ہے اور اس کے مطابق عمل کرنا بھی درست ہے، چنانچہ اگر حنفی مدعی یا مدعی علیہ کا فیصلہ کسی شافعی یا مالکی قاضی کے پاس پہنچایا گیا اور اس نے اپنے ہی مذہب کے مطابق فیصلہ کیا تو یہ فیصلہ بھی نافذ ہو گا اور کسی دوسرے قاضی کے پاس اگر یہی قضیہ نظر ثانی کے لئے پیش ہو جائے تو اس پر اس فیصلہ کو نافذ رکھنا لازم ہے، اگرچہ اس کا اپنا موقف کچھ اور رہو جبکہ ثالث کے فیصلے کا یہ حال نہیں ہے۔

۳: قاضی کو چونکہ حاکم کی طرف سے اختیارات تفویض ہوتے ہیں، اس لئے وہ اپنے ماتحت تمام رعیت پر ولایت عامہ رکھتا ہے اور شرعی حدود میں رہتے ہوئے کسی بھی قضیہ میں اپنے اختیارات استعمال کرسکتا ہے جبکہ ثالث کا اختیار فریقین کے تفویض

کرنے پر ہی موقوف ہوتا ہے،وہ اگر اختیار دیں گے تو جب تک معزول نہ کریں ،اس وقت تک اختیار حاصل ہو گا اور جب وہ معزول کریں،اس کا اختیار بھی جاتا رہے گا۔

تحکیم کے فوائد

نظامِ تحکیم کے قیام کے نمایاں فوائد یہ ہیں:

الف: اللہ تعالیٰ کا ایک حکم کا قائم ہونا۔یوں تو تحکیم بذات خود ایک مباح کام ہے جو فرض یا واجب نہیں ہے، بنیادی ضروری چیز یہ ہے کہ لوگوں کے باہم تنازعات دینی تعلیمات کے مطابق حل کر لئے جائیں،اس کے لئے شریعت نے قضاء کا شعبہ قائم فرمایا۔ اگر قضاء سے یہ مقصود پورا ہوتا ہے تو بہت اچھا اور اس کے ہوتے ہوئے تحکیم مباح ہو کر رہے گی،لیکن اگر کہیں نظامِ قضاء سے یہ مقصود حاصل نہ ہوتا ہو،وہاں تحکیم کی دینی حیثیت واہمیت بڑھ جائے گی اور اگر شرعی نظامِ قضاء کی طاقت نہ ہو تو اپنی استطاعت کی حد تک نظامِ تحکیم کا قائم کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

ب: جس طرح نظام قضاء بہت سے معاصی ومنکرات سے بچنے بچانے کا ایک مستحکم ذریعہ تھا، یوں ہی اس کے نہ ہونے کی صورت میں نظامِ تحکیم کا بھی یہی حال ہے۔لوگوں کے تنازعات کو حل کرنے کی سرے سے کوئی کوشش ہی نہ کی جائے یا کوشش تو کی جائے لیکن اس میں شرعی تعلیمات کا پاس ولحاظ نہ رکھا جائے تو دونوں صورتوں میں منکرات کا ارتکاب کرنا تقریباً یقینی ہے۔

ج: مروجہ عدالتی نظام کی بنسبت تحکیم کا راستہ سستے انصاف کا بھی حامل ہے اور سہولت کا بھی۔اس کے سہارے سہولت کے ساتھ انصاف حاصل کیا جاسکتا ہے۔

د: اس میں زیادہ تاخیر کے بغیر ہی حق دار کو حق مل جاتا ہے۔

ر:عدالتی نظام کی بنسبت اس میں پیچیدگی بھی کم ہے۔

س: تحکیم اگر دینی تعلیمات کے مطابق ہو تو یہ خدمت دین کا بھی بہت بڑا ذریعہ ہے اور اس کو آسانی کے ساتھ لوگوں کے دینی شعور بیدار کرنے کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے ،اس کے ذریعے ان کے اندر دینی حس اور جامع دین کی فکر و احساس کو بیدار کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب دوم:

- ❖ فصل اول: فصل نزاع کی مختلف صورتوں کا تحقیقی و تطبیقی جائزہ
- ❖ فصل دوم: دینی مدارس میں تحکیم کی رائج صورتیں اور ان کا تنقیدی جائزہ

فصل اول:

نزاع کی مختلف صورتوں کا تحقیقی و تطبیقی جائزہ

اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ انسان مدنی الطبع اور اجتماعیت پسند واقع ہوا ہے، وہ فطری طور پر اس بات کا خواہاں ہوتا ہے کہ اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ مل کر رہے، سب سے الگ تھلگ زندگی گزارنا اس کی طبیعت و مزاج کے خلاف ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی محتاجِ دلیل نہیں ہے کہ انسان جب اپنے اس طبعی جذبے کے مطابق مل جل کر رہیں گے تو ان کے درمیان متنوع قسم کے اختلافات و نزعات پیش آئیں گے، ایسا ہونا بہت ہی بعید ہے کہ انسانی معاشرہ ہو اور اس میں باہم کوئی تنازع و اختلاف ہی پیش نہ آئے، حضرات انبیائے کرام (علیہم الصلاۃ والسلام) کے علاوہ کسی انسانی معاشرے میں اس کا تجربہ آج تک شاید نہیں ہوا۔

لہٰذا یہ دو باتیں تو بدیہی سی ہیں کہ:

الف: انسان اجتماعیت پسند ہے، مل جل رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔ ب: مل جل کر رہنے کی صورت میں باہم اختلافات و تنازعات پیدا ہوتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جب دو یا زیادہ افراد کے درمیان کوئی نزاع و اختلاف پیش آئے تو اس وقت وہ کیا کریں گے؟ اور ان کو ایسے وقت کیا کرلینا چاہئے؟ ظاہر ہے کہ اس کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں:

الف: نزاع کو حل کرنے کی فکر ہی نہ کریں۔ اس پہلو کا نقصان کسی عقل مند سے چھپا نہیں ہے، انجام کار یہی ہوگا کہ بدامنی، باہم دشمنی، لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت گری وغیرہ

چیزیں انسانیت کے گلے کا طوق بن جائیں گی، معاشرے میں حد درجہ بگاڑ لازم آجائے گا اور جن مقاصد کی خاطر اجتماعی زندگی کو ترجیح دیدی گئی تھی، وہ بالکل حاصل نہ ہوں گے۔

ب: نزاعات کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔

یہی صورت معقول، مفید اور مناسب ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب متنازع فریقین اس پہلو پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور وہ کوشش کرنا شروع کرتے ہیں کہ کسی طرح باہمی نزاع واختلاف کا تصفیہ کرلیں تو وہ کہاں اور کس کے پاس جاکر استغاثہ کریں؟ کہاں ان کا یہ مقصود حاصل ہوگا؟ اس مقصد کی تکمیل کے لئے انسانی معاشرے میں مختلف ادارے وجود میں آتے ہیں، ذیل میں ان اداروں اور ان کے کام کا تطبیقی جائزہ لیا جاتا ہے۔

پہلا ادارہ: سرکاری عدالتیں

دنیا میں جتنی حکومتیں قائم ہوتی ہیں، وہ اپنی ذمہ داری سمجھتی ہیں کہ عوام کے باہمی جنگ وجھگڑوں کا تصفیہ کرنے کے لئے عدالتیں قائم کریں، عدالتوں کا طریقہ کار اور بنیادی دستور وآئین خواہ کچھ بھی ہو، لیکن اتنی بات تمام حکومتوں کے درمیان قدرِ مشترک ہے کہ عوام کے لئے عدالتی ڈھانچہ قائم کرتی ہیں۔

شرعی تجزیہ

ان عدالتوں کے فیصلہ کا مصدر اور طریقہ کار اگر شرعی ضوابط کے مطابق ہو تو زہے قسمت، اور اس سے زیادہ بہتر متبادل شکل شاید کوئی اور نہ ہو لیکن موجودہ حالات میں ہماری بدقسمتی یہی ہے کہ ایسا عدالتی نظام عام مسلمان کہلانے والے ممالک میں بھی موجود نہیں ہے۔ اس وقت جو عدالتی نظام کا مصدر وطریقہ کار ہے وہ خالص سیکولر یا نیم سیکولر تقاضوں کا حامل اور اسی پر مبنی واستوار ہے۔ اب ایسے نظامہائے عدالت کی طرف

جانااوران کے سہارے اپنے نزاعات کافیصلہ کرانے میں کچھ خامیاں ہیں جن میں سے چند نمایاں خامیاں درج ذیل ہیں:

الف:اس میں متعدد منکرات کاارتکاب کرنا پڑتا ہے،رشوت،جھوٹ وغیرہ کا ناجائز کاموں کی کثرت کے ساتھ نوبت آتی ہے،بعض اوقات اس کے بغیر جائز مقصد کو حاصل کرنا بھی مشکل ہوجاتا ہے۔جن کے دل میں ایمان راسخ اور مضبوط ہوتا ہے وہ تو بہر حال اپنے دامن کو گناہوں سے پاک ہی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں،لیکن ہمارے ہاں اکثریت انہی لوگوں کی ہے جو متوسط یا کمزور ایمان والے ہیں،ان کے لئے ایسے موقع پر اپنے دامن کوبچاناخاصامشکل ہوجاتا ہے۔

ب: قانون سازی میں شریعت کے احکام کا کوئی پاس ولحاظ نہیں ہوتا،یہی وجہ ہے کہ قوانین کا ایک ذخیرہ ہے جوشرعی تعلیمات کے خلاف ہوتا ہے،شرعی تعلیمات سے واضح طور پر متصادم چیزوں کوقانون کادرجہ دینانہایت خطرے کی بات ہے جس سے بعض اوقات انسان کادین وایمان بھی سلامت نہیں رہتا۔یہ خطرہ اور خرابی جس طرح قانون بنانے میں ہے یوں ہی اس کو قانون تسلیم کرنے اور اس کی طرف بخوشی ورغبت اپنے مقدمات لے جانے میں بھی ہے۔

ج:فیصلہ کے لئے جو افراد نامزد ہوتے ہیں،ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جوعدل وتقویٰ کے متضاد صفات سے متصف ہوتے ہیں،ان کو اپنے اختیار سے یہ درجہ دیناشرعادرست نہیں ہے،فقہائے کرام یہاں تک تحریر فرماتے ہیں کہ کسی فاسق شخص کواپنے اختیار سے امامِ مسجد بنانا مکروہ ہے بلکہ اگرکوئی دوسرا آسان متبادل صورت ممکن ہوتو اس کی اقتداء کرنا بھی کراہت سے خالی نہیں ہے،اس کی ایک وجہ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ

فاسق کو ولایت کا اختیار حاصل نہیں ہوتا۔جب ایک مسجد کی امامت اور اس کی اقتداء کا یہ حکم ہے تو ضلع یا صوبے کے عہدہ قضاء کا کیا حکم ہو گا؟ وہاں تو ولایت کا پہلو بالکل ظاہر ہے۔

دوسرا ادارہ: قومی جرگہ

پشتون قوم کا ایک روایتی طریقہ قومی جرگہ بھی ہے،اگر دو افراد یا اقوام کا آپس میں کوئی نزاع پیدا ہو جاتا ہے تو جرگہ کے ذریعے اس کو نمٹایا جاتا ہے،نزاع و اختلاف کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے اور عام طور پر یہ کوششیں بار آور بھی ثابت ہوتی ہیں۔عدالتی نظام کی بنسبت اس میں کچھ خوبیاں بھی ہیں کہ عدالت کی بنسبت جرگہ کے ذریعے انصاف جلدی بھی وصول ہوتا ہے اور سستا بھی۔نیز عدالتوں کے ذریعے تصفیہ کرنے کی صورت میں فریقین کے درمیان نفرت وعداوت کا بیج برقرار رہتا ہے،صرف قانونی دباؤ کی وجہ سے کوئی ایک فریق ہار قبول کرتا ہے جبکہ جرگہ کے ذریعے نفرت کا بیج ختم کرنے کی بھی پوری کوشش کی جاتی ہے۔

نظامِ جرگہ کا شرعی تجزیہ

شرعی و فقہی نقطہ نظر سے جرگہ کی حیثیت بھی تحکیم یا مصالحت کی ہے، تاہم ہمارے ہاں مروجہ جرگوں میں متعدد شرعی خامیاں ہیں جن کی وجہ سے اس کی افادیت بھی متاثر ہو جاتی ہے اور اس میں وہ خرابی بھی در آتی ہیں جو عدالتی نظام کے تجزیہ کے ضمن میں ذکر کی گئی ہے۔یہاں اختصار کے ساتھ ایسی ہی چند خرابیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

الف: فیصلہ عرف ورواج وغیرہ کی بنیاد پر کیا جاتا ہے، شرعی احکام وتعلیمات کا پاس ولحاظ نہیں رکھا جاتا۔

ب:ارکان جرگہ کے تقرری سے لے کر فیصلہ کروانے تک مراحل میں اکثر یا بسااوقات متنوع منکرات کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔

ان دونوں خرابیوں کے مدنظر اس میں اور سرکاری عدالتی نظام میں کوئی زیادہ فرق برقرار نہیں رہتا۔

جرگہ اور عدالتی نظام میں ایک اساسی فرق

البتہ دونوں کے درمیان ایک بڑا جوہری فرق ہے،وہ یہ ہے کہ عدالتی نظام کی موجودہ خرابیوں کو دور کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے،کیونکہ وہ پورا نظام ایک منظم حکومت وریاست کے تحت چل رہا ہوتا ہے،افراد خواہ کتنے ہی نیک کیوں نہ ہو لیکن نظام کی تمام خرابیوں کی پائیدار اصلاح اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ریاستی نظم کا بنیادی ڈھانچہ ہی تبدیل نہ کیا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ ایک دل گردے کا کام ہے جس تک پہنچنے کا راستہ بہت صبر آزما، کھٹن، دشوار گزار اور بہت کچھ طاقت ووقت کا متقاضی ہے جبکہ جرگہ کے نظام کی درستگی اس کی بنسبت بہت آسان ہے،اور کچھ بھی نہ ہو تو اگر کچھ افراد مختلف علاقوں میں اصلاح کی نیت سے کھڑے ہو کر شرعی تعلیمات کے مطابق جرگہ جات قائم کرنے کا انتظام کرلیں تو کچھ ہی وقت میں بڑی حد تک نظام درست ہو جائے گا۔

تیسرا ادارہ:ڈی آر سی

ہمارے ہاں وطن عزیز پاکستان کے بہت سے علاقوں میں ایک اور ترتیب بھی رائج ہے،وہ یہ ہے کہ لوگوں کو باہمی تنازعات حل کرنے کے لئے محکمہ پولیس کی چوکیوں میں ہفتہ وار ایک دن کمیٹی بیٹھتی ہے جو لوگوں کے جنگ جھگڑوں کا تصفیہ کرتی ہے۔اس کا طریقہ کار قریب قریب وہی ہوتا ہے جو جرگہ کے تحت ذکر کیا گیا ہے، تاہم عام جرگہ کی

بنسبت اس میں کچھ تھوڑی بہت ریاستی سرپرستی بھی دکھائی دیتی ہے، اس لئے بعض جگہ یہ زیادہ مفید ثابت ہو جاتی ہے۔

چوتھا ادارہ: جماعت المسلمین

یہ فقہائے مالکیہ کی اصطلاح ہے، ان کا فقہی مسلک یہ ہے کہ اگر کہیں کسی جگہ شرعی نظام قضاء قائم نہ ہو سکے، وہاں اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت اگر کسی قضیہ میں فیصلہ کرنے کے لئے مقرر ہو جائے تو ان کا فیصلہ بھی قضاء قاضی کی طرح شمار ہو گا، اس جماعت کے افراد تین بھی ہو سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس طرح جماعت المسلمین کا فیصلہ تحکیم ہی کے ذیل میں آئے گا جو تمام احکام میں قضاء قاضی کی طرح نہیں ہے بلکہ متعدد احکام میں اس سے مختلف ہے۔

فقہی تجزیہ

یہ نظام کافی مفید معلوم ہوتا ہے اور انتظامی لحاظ سے اگر اس کی درستگی پر توجہ دی جائے تو کافی حد تک اس کو مؤثر شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے، تاہم فقہائے حنفیہ کا یہ موقف نہیں ہے اور ان کے نزدیک اس جماعت کے فیصلہ کی حیثیت بھی وہی تحکیم کی ہو گی، باقاعدہ قاضی کے فیصلہ کے مساوی نہیں ہے، اس لئے انجام کار یہ بھی تحکیم کے ساتھ مل جاتا ہے۔

پانچواں ادارہ: غیر سرکاری نظامِ قضاء

بعض فقہی کتابوں میں اس قسم کے جزئیات ذکر کئے گئے ہیں کہ اگر کہیں کوئی شرعی قاضی موجود نہ ہو تو مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ اپنے میں سے کسی کو والی بنائیں اور وہ اپنی استطاعت کے مطابق مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کا انتظام کرلے۔ ان جزئیات کی

بناء پر ہندوستان کے بہت سے اہلِ علم کا موقف یہ ہے کہ ہندوستان جیسے ممالک میں امارت شرعیہ قائم کیا جائے اور وہاں سے قاضیوں کی تقرری ہو جایا کرے، نکاح، طلاق اور اوقاف وغیرہ ابواب میں ایسے دار القضاء کا فیصلہ شرعی قضاء شمار ہو گا۔

فقہی تجزیہ

اس نظام کے متعلق بھی وہی تفصیل ہے جو "جماعت المسلمین" کے ذیل میں ذکر کی گئی ہے۔ برصغیر پاک وہند کے اہل علم کا اس باب میں شروع سے اختلاف رہا ہے، بعض اہل علم کے نزدیک قاضی کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس فیصلہ نافذ کرنے کی حسی قدرت بھی موجود ہو اس لئے ان کے ہاں غیر سرکاری طور پر اس طرح کسی کو متعین کرنے سے وہ شرعی قاضی نہیں بنے گا اور اس کے فیصلہ کی حیثیت بھی شرعی قاضی کے فیصلہ کی نہیں ہو گی بلکہ انجام کار یہ بھی وہی تحکیم کی ایک شکل قرار پائے گی۔ جبکہ دوسرے بہت سے اہل علم کا موقف یہ ہے کہ قاضی کے لئے اس طرح عملی قوت کا ہونا ضروری نہیں ہے، لہٰذا اگر امارت کے متعین کرنے یا عام مسلمانوں کے باہم اتفاق سے کوئی اس طرح فیصلہ کرنے کے لئے متعین ہوتا ہے تو وہ فی الجملہ قاضی ہی سمجھا جائے گا اور اس کے فیصلہ کی قریب قریب وہی حیثیت ہو گی جو قاضی کے فیصلہ کی ہوتی ہے۔

فصل دوم: دینی مدارس میں تحکیم کی رائج صورتیں اور ان کا تنقیدی جائزہ

حکومتی تسلط سے آزاد دینی مدارس اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے جس سے برصغیر پاک وہند اور بنگال مالا مال ہے، ان مدارس میں دار الافتاء کے ساتھ بہت سے اداروں میں تحکیم کا بھی ایک شعبہ قائم ہوتا ہے جس کو بسا اوقات "قضاء" سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ تحکیم کا یہ نظام چونکہ باقاعدہ کسی وفاق وغیرہ کے ماتحت نہیں ہے، اس

لئے تمام مدارس میں اس کا نظم یکساں نہیں ہے بلکہ مدرسہ کا انتظامیہ، محل وقوع وغیرہ متعدد عناصر کی وجہ سے ہر جگہ اس کی انتظامی صورتیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔اس ناکارہ راقم نے اس حوالہ سے مختلف مدارس کا نظم معلوم کیا، بعض جگہ خود جاکر مشاہدہ کیا تاکہ کوئی مناسب اور معیاری ترتیب سمجھ سکے، ان مختلف شکلوں کا اجمالی خلاصہ درجِ ذیل ہے:

الف: بعض جگہ تو خود علماء کرام جرگہ کی جگہ حاضر ہوتے ہیں اور وہ جرگہ ہی کی طرح فریقین کی باتیں سنتے ہیں اور وہی اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ فیصلہ بھی عام طور پر جرگہ کے عام فیصلوں کی طرح مصالحت پر مبنی ہوتا ہے، کوئی باقاعدہ شرعی فیصلہ نہیں ہوتا۔

ب: فریقین کو دار الافتاء آنے کا پابند بنایا جاتا ہے، دار الافتاء میں فریقین کے بیانات لے کر فوراً یا چند دنوں بعد فیصلہ کرتے ہیں۔

ج: فریقین دار الافتاء حاضر نہیں ہوتے بلکہ ہر فریق اپنی طرف سے کسی کو مقرر کرتا ہے جس کو "جرگہ مشر" بھی کہا جاتا ہے، متعلقہ فریق اس کو اپنی طرف سے مکمل اختیار دیتا ہے کہ جو بھی فیصلہ سامنے آئے گا، منظور ہوگا اور پھر یہ دونوں وکیل جاکر دار الافتاء حاضر ہوتے ہیں۔ فیصلہ کرنے والوں کو اگر تنقیح وغیرہ کی ضرورت پڑتی ہے تو بھی براہ راست فریقین سے رابطہ نہیں ہوتا بلکہ انہی دو وکیلوں کے ذریعے تنقیحات کرائی جاتی ہیں۔ فیصلہ تیار ہوجانے کے بعد یہی وکیل حاضر ہوتے ہیں اور انہی کو فیصلہ سنایا سمجھایا جاتا ہے، پھر دونوں جاکر اپنے اپنے فریق سے منواتے ہیں۔

جن جگہوں میں یہ تینوں صورتیں رائج ہیں، وہاں مشاہدہ یہ ہوا کہ باقاعدہ فیصلہ تحریری طور پر تیار نہیں کیا جاتا بلکہ یا تو وہ فیصلہ درحقیقت صلح ومصالحت ہی کی ایک شکل ہوتی ہے اور یا فتویٰ کی صورت میں مختصر سی بات لکھی جاتی ہے۔

د: سرکاری عدالتی نظام کی طرح مخصوص اوقات میں باقاعدہ مجلس تحکیم قائم کی جاتی ہے، مدعی اور مدعی علیہ حاضر ہوتے ہیں، پھر مجلس تحکیم کو زبانی یا تحریری طور پر فیصلہ کرنے کا اختیار دیدیتے ہیں، اس کے مطابق باقاعدہ عدالتوں کی طرف سے دعویٰ اور جواب دعویٰ تحریری طور پر مجلس کے پاس جمع کئے جاتے ہیں، اس کے بعد باقاعدہ گواہوں اور قسم اٹھانے کا مرحلہ چلایا جاتا ہے اور فیصلہ کے لئے ایک خاص وقت دیا جاتا ہے، فیصلہ اسی طریقے پر دلائل اور فریقین کے دلائل وشواہد کے تجزیے کے ساتھ لکھا جاتا ہے جس طرح عدالتی نظام کے تفصیلی فیصلوں میں ہوتا ہے۔

اس ترتیب میں اور سرکاری عدالتی نظام میں اگر کچھ فرق ہے تو یہی کہ یہاں کی مجلس تحکیم کو سرکاری طور پر فیصلہ کی ذمہ داری نہیں سونپ دی جاتی اور فیصلہ میں اس کو خاص قانون کے مطابق ہی فیصلہ کرنے کا پابند بنایا جاتا ہے بلکہ فریقین کی طرف سے ان کو اختیار حاصل ہو جاتا ہے اور شرعی تعلیمات وہدایات کے مطابق فیصلہ کرنے کے پابند ہوتے ہیں، چاہے وہ قانونِ وقت کے موافق ہو یا مخالف۔ جبکہ سرکاری عدالتی نظام ان دونوں باتوں میں اس سے مختلف ہے۔

مناسب نظم اور کچھ تجاویز

ان مختلف قسم کی صورتوں کو جانچنے اور سمجھنے کے بعد سب سے مناسب صورت یہی سمجھ میں آتی ہے کہ سب شکلوں کی محاسن اور خوبیوں کو لے کر کوئی ترتیب تشکیل دی جائے۔ اس

معقول ضابطہ کے مطابق آخر میں جو صورت تحریر کی گئی ہے، مجموعی طور پر یہی ترتیب زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے جس کے دعویٰ، جواب دعویٰ اور فیصلوں کے کچھ نمونے بعد میں ذکر کئے جاتے ہیں۔

البتہ اس کے ساتھ ساتھ درج ذیل باتوں کی طرف بھی خاطر خواہ توجہ دیدینی چاہئے:

ا: باقاعدہ فیصلہ کرنے سے پہلے بہر حال مصالحت کا موقع دیا جائے، ترغیب دی جائے۔فیصلہ کی بجائے صلح میں فائدے کی بات یہ ہے کہ فریقین اور ان کے اہل خانہ وغیرہ کے باہمی تعلقات کچھ زیادہ خراب نہیں ہوتے۔

۲: دارالافتاء ہو یا مجلس تحکیم، دونوں کے پاس چونکہ قوت نافذہ موجود نہیں ہوتی جو بہر حال فریقین کو فیصلہ ماننے اور اس کے مطابق عمل درآمد کرنے پر مجبور کرے، اس لئے فیصلہ کی کاروائی شروع کرنے سے پہلے فریقین کی سنجیدگی کا اندازہ لگالینا چاہئے کہ وہ واقعۃً سنجیدگی کے ساتھ فیصلہ کروانا چاہتے ہیں؟ اور اگر فیصلہ ان کے خیال/مفاد کے خلاف ہو تو اس کی تعمیل بھی کریں گے یا نہیں؟

ان باتوں کی اچھی طرح جائزہ لئے بغیر جو فیصلے صادر ہوتے ہیں، عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ وہ مؤثر نہیں ہوتے۔

۳: قانون کی حیثیت، اہمیت وافادیت محتاج بیان نہیں ہے۔معمولی چیز جب قانون کا روپ دھار لیتی ہے تو اس کی ایک خاص اہمیت پیدا ہو جاتی ہے جبکہ اس کی بنسبت اہم بات اور کارگر چیز کیوں نہ ہو لیکن جب تک اس کو قانون کا لباس نہیں پہنایا جاتا، تب تک اس کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہوتی جو ہونی چاہئے تھی۔

اس تناظر میں اس بات کی بھی بھرپور کوشش کرلینی چاہیئے کہ "شرعی مجلس تحکیم" کے فیصلوں کو قانونی حیثیت دلانے کے لئے اپنی حد تک خوب تگ ودو کی جائے۔ یہ کتنے ہی افسوس کی بات ہے کہ اسلام کے نام اور اس کے عنوان پر جو ملک پھلا پھولا ہو، وہاں سینکڑوں خلافِ اسلام قوانین تو بزور بازو نافذ کردی جائیں، اس کے مطابق فیصلوں کو فوج و پولیس کی طاقت کے ذریعے مسلط کردیا جائے لیکن اسلامی تعلیمات کے مطابق فیصلے کرنے پر اگر دو افراد باہمی رضامندی سے بھی متفق ہوجاتے ہیں تو اس کو کوئی قانونی حیثیت نہیں دی جاتی!

☆☆☆☆☆☆☆

باب سوم:

- فصل اول: تحکیم سے وابستہ شرعی وفقہی مسائل
- فصل دوم: تحکیم کے تصور و تصدیق سے متعلقہ اشکالات وشبہات کا جائزہ

فصل اول: تحکیم سے وابستہ شرعی و فقہی مسائل

حکم کے فیصلے کی فقہی تکییف: فیصلہ یا صلح؟

صلح اور فیصلہ میں فرق ہے، بعض جگہ کسی فریق پر شرعی نقطہ نظر سے کچھ دینا واجب نہیں ہوتا اور وہ جھگڑا کو ختم کرنے کے لئے کچھ دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے، یا اپنے اوپر واجب مقدار سے زیادہ رقم دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے، اب فیصلہ کی رو سے اس فریق پر یہ دونوں چیزیں لازم نہیں کی جا سکتیں لیکن صلح کی صورت میں اس میں مضائقہ نہیں ہے بلکہ صلح عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ تحکیم کی صورت میں ثالث و حکم جو کچھ فیصلہ کرتا ہے اس کی فقہی تکییف کیا ہوگی؟ شرعی فیصلہ پر اس کو محمول کر دیا جائے گا یا باہم مصالحت کی ایک صورت قرار دیدی جائے گی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ معاملہ کی تفصیلات کو دیکھا جائے گا:

الف: اگر فریقین نے ثالث کو اپنے درمیان شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار سپرد کیا ہو تو وہ شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کا ہی پابند ہے، اگر اس کا کیا ہوا فیصلہ شرعی احکام کے مطابق ہے تو نافذ ہوگا ورنہ نہیں۔ البتہ اگر وہ فیصلہ کی بجائے باہم مصالحت کو مناسب خیال کرے تو فریقین کو اس کے لئے آمادہ کر لے، اگر وہ اس بات کا اختیار دیدیتے ہیں تو مضائقہ نہیں ہے۔

ب: اگر فریقین نے نزاع ختم کرنے اور جھگڑا نمٹانے کے لئے اس کو صلح و مصالحت کے لئے متعین کیا ہو اور اسی کا اس کو اختیار دیا ہو تو اس صورت میں اس کا اقدام شرعی فیصلہ شمار نہ ہوگا بلکہ صلح قرار پائے گا جو اگر فریقین کی رضامندی سے انجام پایا ہے تو اس کی پاسداری ضروری ہے۔

مصالحت ہونے پر ایک استدلال اور اس کا جواب

یہاں یہ بات بھی ذکر کرنا مناسب ہے کہ بعض فقہی مصادر میں امام خصاف رحمہ اللہ وغیرہ فقہاء کرام کا یہ موقف ذکر کیا جاتا ہے کہ حکم کا فیصلہ فریقین کے حق میں صلح کا قائم مقام ہوتا ہے اور اس سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ ثالث کے فیصلہ کی فقہی حیثیت ہی صلح کی ہے، فیصلہ نہیں ہے، لہٰذا اگر کہیں وہ کسی فریق کے ذمہ کوئی ایسی چیز ضروری قرار دے جو شرعی نقطہ نظر سے اس کے ذمہ ضروری نہ ہو تو بھی چونکہ یہ صلح ہے اس لئے بہر حال درست ہے اور بہر صورت اس کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے۔ وہ عبارت یہ ہے:

وذكر الخصاف: ولا يجوز حكم المحكم في حد أو قصاص؛ لأن حكم المحكم بمنزلة الصلح، فكل ما يجوز استحقاقه بالصلح يجوز التحكيم فيه، وما لا فلا، وحد القذف والقصاص لا يجوز استيفاؤهما بالصلح وبعقد ما فلا يجوز التحكيم فيهما. وذكر في الأصل أنه يجوز التحكيم في القصاص؛ لأن التحكيم تفويض وتولية في حقهما وإن كان صلحا في حق غيرهما وهما يملكان استيفاء القصاص فيصح تفويضه إلى غيرهما. [1]

ترجمہ: امام خصاف رحمہ اللہ ذکر کرتے ہیں: ثالث کا فیصلہ حدود و قصاص میں معتبر نہیں ہے؛ اس لئے کہ ثالث کا فیصلہ صلح کا قائم مقام ہوتا ہے، پس جس چیز کا استحقاق صلح کے ذریعے جائز ہوتا ہے اس میں تحکیم جائز ہے اور جو اس طرح نہیں ہے اس میں تحکیم جائز

[1] معين الحكام فيما يتردد بين الخصمين من الأحكام: الباب الخامس في أركان القضاء، فصل فيما يصح فيه حكم المحكم وما لا يصح، ج1، ص25

نہیں، حد قذف اور قصاص کے حصول صلح و راس کے علاوہ کسی بھی عقد کے ذریعے جائز نہیں ، پس اس میں تحکیم جائز نہیں، "کتاب الاصل" میں ہے کہ قصاص میں تحکیم جائز ہے؛ اسلئے کہ تحکیم مدعی اور مدعی علیہ کے حق میں سپردگی ہے اگرچہ غیر کے حق میں صلح ہے اور یہ دونوں قصاص کے حصول کے مالک ہیں، پس اس کو اپنے غیر کے حوالے کرنا درست ہے۔

اس عبارت کی بنیاد پر یہ استدلال کرنا، کہ حکم کا فیصلہ بہرحال صلح ہی شمار ہو گا، درست نہیں ہے۔یہاں حکم کے کئے ہوئے فیصلہ کو تمام باتوں میں صلح نہیں قرار دیا جارہا، یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہائے کرام نے بہت سے مسائل میں حکم کے فیصلہ پر اسی حیثیت سے دسیوں احکام متفرع فرمائے ہیں کہ وہ فقہی نظر سے صلح نہیں بلکہ قضائے قاضی کی طرح باقاعدہ فیصلہ ہے، مثال کے طور پر امام خصاف رحمہ اللہ کی درج بالا تحقیق ذکر کرنے کے بعد "شرح ادب القاضی للخصاف" میں ہے:

وإن حكما في دم خطأ، فحكم على العاقلة بالدية لم يجز ذلك. لأن العاقلة لم ترض به، وحكم المحكم إنما ينفذ على من رضي بحكمه وهو المحكم.وإن قضي بالدية على القاتل لا يجوز. لأن هذا الحكم مخالف للشرع، فإن الدية في قتل الخطأ على عاقلة، إلا أن يكون القاتل أقر بالقتل خطأ فحينئذ يجوز حكمه بالدية عليه. لأن مايجب بالاعتراف لا تتحمله العاقلة، وإنما يجب على المقر، فكان حكمه موافقاً للشرع فينفذ.1

---

[1] شرح «أدب القاضي للخصاف» للصدر الشهيد ت سرحان: ، الباب السادس والسبعون (في الخصمين يحكمان بينهما حكماً) ،التحكيم في الدم الخطأ، ج4،ص64

ترجمہ: اگر فریقین نے قتل خطامیں کسی کوثالث بنایااور اس نے عاقلہ پر دیت کافیصلہ کرلیا تو یہ نافذ نہیں ہو گا؛اس لئے کہ عاقلہ اس کے فیصلے پر را ضی نہیں ہیں، کیونکہ ثالث کافیصلہ صرف فریقین ہی پر نافذ ہیں اور اگر ثالث قاتل پر دیت کافیصلہ کر لے تو یہ نافذ نہیں ہو گا کیونکہ یہ فیصلہ شرعی حکم کے خلاف ہے کہ قتل خطامیں دیت خود قاتل پر نہیں بلکہ اس کے عاقلہ پر لازم ہوتی ہے ,الا ّیہ کہ قاتل خود خطاً قتل کرنے کااقرار کرلے تواس وقت قاتل پر دیت کافیصلہ کرنا جائز ہے؛اس لئے کہ جو چیز اقرار سے ثابت ہو جائے وہ صرف مقر ہی پر واجب ہوتا ہے عاقلہ اس کا تحمل نہیں کرتا، پس یہ فیصلہ شرعی حکم کے موافق ہے؛اسلئے نافذ ہو گا۔

یہاں یہ مسئلہ ذکر کیا گیاہے کہ اگر ثالث قتل خطامیں قاتل پر دیت کافیصلہ کرلے تو یہ نافذ نہیں ہو گا کیونکہ یہ فیصلہ شرعی حکم کے خلاف ہے کہ قتل خطامیں دیت خود قاتل پر نہیں بلکہ اس کے عاقلہ پر لازم ہوتی ہے۔

فیصلہ کرنے پر اجرت لینا

پہلے ذکر کیا گیا کہ تحکیم کبھی تو باقاعدہ فیصلے کی شکل میں ہوتی ہے اور کبھی صلح ومصالحت کی صورت میں۔ فیصلہ ہونے کی صورت میں اس پر اجرت لینا شرعا درست نہیں ہے،اس تقدیر پر یہ بھی ان عبادات میں سے ایک ہے جن پر اجرت کالینا دینا درست نہیں ہے اور جہاں اس کی حیثیت صلح کی ہوتی ہے وہاں اس پر اجرت لینا بھی درست ہوتا ہے ،اس تقدیر پر اس کی نوعیت بھی دیگر تمام جائز معاملات کی ہوتی ہے،جس پر ان کے انجام دینے پر اجرت کالینا دینا درست ہے یوں ہی اس میں بھی مضائقہ نہیں ہے جبکہ اجرت کو پہلے سے باہمی اتفاق کے ساتھ طے کرلیا جائے۔

البتہ جس طرح عام حالات میں کسی کی مجبوری سے غلط فائدہ اٹھانا درست نہیں ہے بلکہ مذموم ہے یوں ہی جنگ وجھگڑے یا باہمی نزاع وخصومت کے وقت بھی فریقین کی

مجبوری سے غلط فائدہ اٹھانا مذموم ہی ہے بلکہ صلح وفیصلہ کے وقت ایسا کرنا کچھ زیادہ ہی نامناسب اور غیر اخلاقی کام معلوم ہوتا ہے کیونکہ باہمی اختلاف کی وجہ سے کشید گی پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے مجبوری کی نوعیت بھی کچھ زیادہ ہو ہی جاتی ہے، لہٰذا ایسے موقع پر زیادہ اجرت/فیس لینا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

یہ کتنے ہی افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ بہت سی جگہوں میں جرگہ/تحکیم کو ایک کاروبار وتجارت کی حیثیت حاصل ہو رہی ہے،اس کو ذریعہ آمدنی کے طور پر اختیار کیا جارہا ہے اور دیگر بہت سے پیشہ جات کی طرح اس عظیم کام کو بھی پیشہ وارانہ بنیادوں پر اختیار کیا جاتا ہے، ابھی تک تو یہ کام دینی جذبہ ،انسانی ہمدردی اور معاشرتی وقومی خدمت کے طور پر کیا جاتا رہا ہے اور یہی اس کی مناسب حیثیت ہے،اس جذبے کے ساتھ یہ کام انجام دیا جائے تو کارگر اور نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے جس کے برگ وبار سے پورا معاشرہ فائدہ اٹھاتا ہے، لیکن پیشہ وارانہ طور پر اس کو اختیار کیا جائے تو ظاہر ہے کہ باہمی جھگڑوں اور کشیدگیوں میں اضافے کا باعث بنے گا جس کا اثر پورے معاشرے پر پڑے گا۔

فریقین کا الگ الگ حکم مقرر کرنا

تحکیم میں جس طرح یہ صورت جائز ہے کہ دونوں فریق کسی ایک ثالث یا متعدد افراد پر راضی ہوجائیں اور ان کو اپنے درمیان فیصلہ کرنے کا اختیار سپرد کریں ،یوں ہی یہ بھی درست ہے کہ ہر فریق اپنی طرف سے الگ الگ شخص کو حکم کے طور پر متعین کریں، مثال کے طور پر زید اور عمر کا آپس میں کوئی نزاع ہے، زید نے اپنی طرف سے ماجد کو جبکہ عمر نے اپنی جانب سے واجد کو حکم مقرر کیا۔البتہ جن کو حکم متعین کیا جائے، ان کی ذمہ داری ہے کہ اپنے موکل کی تائید وحمایت میں شرعی حدود سے تجاوز نہ کرے، اس کی خاطر حق

وباطل میں التباس پیدا کرنے کی کوشش کرے اور نہ ہی جھوٹ و دھوکہ دہی جیسے معاصی کا ارتکاب کرے۔ بعض علاقوں میں جرگہ کی یہ جو ترتیب رائج ہے کہ جس شخص کو جس فریق نے اپنی طرف سے حکم مقرر کیا، اس کی بہرحال طرفداری کرتے ہیں، اس میں سچ و جھوٹ تک کی تمیز نہیں کرتے، یہ بالکل جائز نہیں ہے۔

"مجلۃ الاحکام" میں ہے:

المادة (1843) يجوز تعدد المحكم يعني يجوز نصب حكمين أو أكثر لخصوص واحد ويجوز أن ينصب كل من المدعي والمدعى عليه حكما. 1

ترجمہ: ایک ہی فیصلہ کے لئے ایک یا متعدد افراد کو ثالث کے طور پر مقرر کرنا جائز ہے اور یہ بھی درست ہے کہ مدعی اور مدعی علیہ اپنی طرف سے الگ الگ شخص کو حکم کے طور پر متعین کریں۔

فاسق شخص کو حکم مقرر کرنا

جو شخص کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرے اور پھر اس سے توبہ نہ کرے یا جو شخص صغیرہ گناہوں پر اصرار کرتا ہو، وہ فاسق ہے اور فاسق شخص اس بات کا اہل نہیں ہے کہ اس کو کوئی امتیازی دینی مقام دیا جائے، لہٰذا بلاضرورت فاسق شخص کو حکم مقرر کرنا بھی کسی طرح مناسب نہیں ہے، متعدد فقہائے کرام نے اس کو ناجائز اور گناہ سے بھی تعبیر فرمایا ہے، لہٰذا اس سے

1 مجلة الأحكام العدلية : الكتاب السادس عشر في القضاء، الباب الرابع في بيان المسائل المتعلقة بالتحكيم، ص375

احتراز کرلینا چاہئے اور جہاں تک ہوسکے کسی عادل اور نیک شخص ہی کو ثالثی کے لئے مقرر کرلینا چاہئے۔ "بحر" میں ہے:

قوله (والفاسق أهل للقضاء كما هو أهل للشهادة إلا أنه لا ينبغي أن يقلد) .. وفي فتح القدير ومقتضى الدليل أن لا يحل أن يقضى بها فإن قضى جاز ونفذ. اهـ. ومقتضاه الإثم وعلى الأول لا يأثم وظاهر الآية يفيد أنه لا يحل قبولها قبل تعرف حاله وهي قوله {إن جاءكم فاسق بنبإ فتبينوا أن تصيبوا قوما بجهالة فتصبحوا على ما فعلتم نادمين} وقولهم بوجوب السؤال عن الشاهد سرا وعلانية طعن الخصم أو لا في سائر الحقوق على قولهما المفتى به يقتضي أن يأثم بتركه؛ لأنه للتعرف عن حاله حتى لا يقبل الفاسق، وصرح في إصلاح الإيضاح بأن من قلد فاسقا يأثم[1]

ترجمہ: فاسق جس طرح شہادت کا اہل ہے اسی طرح منصب قضا کا بھی اہل ہے، مگر لائق یہ ہے کہ اس کو منصب قضا سپرد نہ کی جائے... "فتح القدیر" میں ہے کہ دلیل کا تقاضا یہ ہے کہ فاسق کے شہادت پر فیصلہ کرنا حلال نہ ہو، تاہم اگر فیصلہ کیا گیا تو نافذ ہوگا۔ اس دلیل کا تقاضا یہ ہے کہ گنہگار ہوگا، مگر اول دلیل کے بنا پر گنہگار نہیں ہوگا، اور آیۃ کریمہ کے ظاہر سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ فاسق کے حالت معلوم کرنے سے پہلے اس کی شہادت قبول کرنا حلال نہیں ہے، اور وہ آیۃ کریمہ یہ ہے (اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق (یعنی گنہگار یا شریر) تمہارے پاس کوئی خبر لے آئے تو (اس کی) اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم

---

[1] البحر الرائق :كتاب القضاء، باب أهل القضاء، ج6،ص283

نادانی سے کسی قوم کو نقصان پہنچا بیٹھو، پھر تم اپنے کیے پر پچھتاتے)۔اور فقہاء کے اس قول (کہ صاحبین رحمھم اللہ کے مفتی بہ قول کے بناء پر تمام حقوق میں شاہد کے متعلق خواہ خصم اس پر طعن کرے یا نہ کرے ظاہراً وخفیۃً دونوں طرح تحقیق کرنا واجب ہے) کا تقاضا یہ ہے کہ اس سوال کے چھوڑنے سے قاضی گنہگار ہوگا؛ اسلئے کہ یہ سوال فاسق کے حال معلوم کرنے کے لئے ہے تاکہ فاسق کی گوہی قبول نہیں کی جائیگی، اور "اصلاح الایضاح" میں اس بات کی تصریح ہے کہ جس نے فاسق کو منصب قضاء دے دیا تو وہ گنہگار ہوگا۔

اہل جرگہ کا زرِ ضمانت رکھنا

تحکیم وجرگہ میں بہت سی جگہ یہ صورت بھی رائج ہے کہ ثالث/مجلسِ تحکیم پہلے فریقین سے بھاری بھر مقدار میں "زرِضمانت" کے نام سے کچھ نقدی یا دیگر قیمتی چیزیں وصول کرتے ہیں اور یہ بات باہم طے ہوجاتی ہے کہ فریقین فیصلہ کو بہر حال تسلیم کرلیں گے ورنہ جو فریق اس سے روگردانی کرے گا، اس کا "زرِضمانت" واپس نہیں کیا جائے گا، وہ ثالث یا مجلس تحکیم کو دیدیا جائے گا اور وہی اس کے مالک شمار ہوں گے۔ ایسا کرنے کی نوبت اسی لئے پیش آتی ہے کہ سرکاری قاضی کی طرح ثالث کے فیصلے کو بزور بازو تو نافذ کرنے اور فریقین کو اس پر مجبور کرنے کی تو کوئی طاقت موجود نہیں ہے، اب اگر ان جیسے وسائل کی بناء پر فریقین کو فیصلہ ماننے پر مجبور کرنے کا سامان نہ کیا جائے تو اس کی کوئی واقعی حیثیت نہیں رہے گی اور جو فریق اپنے آپ کا نقصان محسوس کرے گا، وہ بہر حال روگردانی کرنے کی جرأت کرے گا۔

ایسا کرنا شرعی نقطہ نظر سے درست ہے یا نہیں؟ اس میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ زرضمانت کے نام پر جو رقم یا دیگر چیز وصول کی جاتی ہے، اس کو ثالث یا مجلس تحکیم بعینہ محفوظ رکھتا ہے یا اس کو اس کے خرچ کرنے اور استعمال کرنے کی بھی صراحت کے ساتھ

یا خاموشی کے ساتھ اجازت ہوتی ہے ؟ پہلی صورت میں اس کی حیثیت امانت کی سی ہو گی جبکہ دوسری صورت میں یہ قرض شمار کیا جائے گا۔ دونوں صورتوں میں تحکیم کے ساتھ اس کو جمع کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، تحکیم کی نوعیت اگر صلح کی ہو اور حکم کو فریقین کی طرف سے صلح کرنے کا اختیار دیا جائے تو بھی اس میں یہ شرط لگانا درست نہیں ہے کہ فریقین پیشگی کچھ رقم یا دیگر چیزیں جمع کر دیں اور نہ ماننے کی صورت میں ثالث اس کو سوخت کر لے اور اگر تحکیم کی حیثیت باقاعدہ فیصلے کی ہو تب بھی محض اس کو نہ ماننے کی وجہ سے رقم سوخت کرنا درست نہیں ہے۔

زرِضمانت سے فیس وصول کرنا

بعض جگہ یہ بھی رواج ہے کہ فریقین سے زرِضمانت رکھواتے ہیں اور پھر جب فیصلہ ہو جاتا ہے تو فیصلہ کرنے والے لوگ اسی جمع شدہ رقم میں سے کچھ رقم اپنی ہی صوابدید کے مطابق فیس کے نام لے لیتے ہیں، بعض فیصلوں کے نتیجے میں کسی ایک فریق کے ذمے دوسرے کو کچھ ادائیگی کرنا ہوتا ہے اور یہ ادائیگی فیصلہ کرنے والے افراد کی وساطت سے عمل میں آتی ہے، جب رقم ان کے ہاتھ میں آتی ہے تو یہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ رقم کاٹ کر اپنے استعمال میں لاتے ہیں کہ یہ ہماری فیس/اجرت ہے، دونوں صورتوں میں متعلقہ فریق نہ راضی ہوتے ہیں اور نہ ہی پہلے اس کا تعین کیا جاتا ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں اس طرح رقم لینا جائز نہیں ہے، اگر ثالث/ کمیٹی اپنی خدمات کے عوض کچھ رقم لینا ہی پیشِ نظر ہو تو کام انجام دینے سے پہلے متعلقہ فریق کے ساتھ اس کی بات صاف صاف کرنی ضروری ہے۔

ثالث کا کسی اور کو ثالث بنانا

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس شخص کو ثالث کے طور پر مقرر کیا جاتا ہے، وہ اپنی جگہ کسی اور کو ثالث ٹھہرا دیتا ہے، یا پانچ افراد کو کسی معاملہ میں فیصلہ کرنے کا اختیار سپرد کر دیا گیا تو وہ اپنے ساتھ کسی اور کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ایسا کرنا درست ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر فریقین کی طرف سے ثالث کو اس بات کی اجازت ہو کہ وہ چاہے تو اپنی جگہ کسی اور کو فیصلہ کرنے کے لئے مقرر کرے یا اپنے ساتھ کسی دوسرے شخص کو بھی فیصلہ میں شامل کر لے تو آگے ثالث کا ایسا کرنا جائز ہے اور اس کا شرعی نقطہ نظر سے اعتبار بھی ہو گا اور اگر اس کو اس بات کا اختیار نہ دیا جائے تو وہ خود اپنی طرف سے اس طرح کرنے کا مجاز نہیں ہے اور اگر کسی کو متعین کرے گا تو اس کے فیصلہ کا اعتبار نہیں ہے۔"مجلہ" میں ہے:

المادة (1845) إذا كان المحكمون مأذونين بالتحكيم فلهم تحكيم آخر وإلا فلا.[1]

ترجمہ: اگر فریقین کی طرف سے ثالثین کو اس بات کی اجازت ہو کہ وہ کسی اور کو فیصلہ کرنے کے لئے مقرر کرے تو ان کا ایسا کرنا جائز ہے ورنہ نہیں۔

اجتہادی مسائل میں تحکیم کا قضیہ

حدود کے علاوہ مسائل میں تحکیم کرنا جائز ہے۔تاہم کیا اجتہادی نوعیت کے مسائل میں کسی ایسے شخص کو بھی حکم بنایا جا سکتا ہے جن کا فقہی مذہب و موقف اجتہادی

[1] مجلة الأحكام العدلية: الكتاب السادس عشر في القضاء، الباب الرابع في بيان المسائل المتعلقة بالتحكيم، ص375

مسائل میں فریقین کے موقف کے خلاف ہو؟ مثال کے طور پر زید اور بکر حنفی ہیں، ان کا کسی مسئلہ میں باہم نزاع پیدا ہو جاتا ہے اور وہ مسئلہ ایسا ہے جس میں فقہائے احناف اور فقہائے شوافع کا اختلاف ہے تو کیا یہ دونوں ایسا کر سکتے ہیں کہ شافعی شخص کو ثالث مقرر کر کے اس سے نزاع کا تصفیہ کروائیں یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ فی نفسہ گو اس کی گنجائش ہو سکتی ہے، تاہم اس سے احتراز ہی کر لینا چاہیئے، حضرات فقہائے کرام اس کو ان مسائل کی فہرست میں سے گنواتے ہیں جن کی ترویج و تشہیر سے گریز ہی کرتے رہنا مناسب ہے۔

کھلی اجازت دینے کے مفاسد

اس کی کھلی چھوٹ دینے کی صورتیں میں درجِ ذیل مفاسد کا دروازہ چوپٹ کھلنے کا اندیشہ ہے:

الف: متاخرین فقہائے کرام نے حالات کا تجزیہ کر کے بالکل بجا طور پر یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ موجودہ حالات میں تقلیدِ شخصی ضروری ہے، اس کے چھوڑنے کی صورت میں مختلف دینی مفاسد کا قوی اندیشہ ہے۔ درج بالا مسئلہ کی کھلی چھوٹ دینے کی صورت میں نقصان یہ ہوتا ہے کہ جن مصالح کے تحفظ اور مفاسد سے بچاؤ کی خاطر تقلیدِ شخصی کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، وہ مصالح ہی ہاتھ سے نکل جاتے ہیں اور مفاسد متحقق ہو جاتے ہیں۔

ب: بعض فقہائے کرام نے اس کی ایک وجہ یہ بھی تحریر فرمائی ہے کہ اگر اس بات کی کھلی اجازت دیدی جائے تو اس سے منصبِ قضاء کی اہمیت وافادیت کو نقصان پہنچے گا یا کم از کم اس کا قوی اندیشہ پیدا ہو جائے گا کہ جب ہر مسئلہ میں اور ہر طرح فیصلہ کے لئے تحکیم سے استفادہ کیا جا سکتا ہے تو پھر خواہ مخواہ قضاء اور قاضی کی عدالت میں جانے اور وہاں

سے فیصلہ کروانے کی زحمت کیوں گوارا کی جائے! علامہ شرنبلالی رحمہ اللہ "حاشیہ درر وغرر" میں فرماتے ہیں:

(قوله ولا يفتي به أي بصـحته في غير ما ذكر لئلا يتجاسر العوام فيه) قال في البرهان ولئلا يذهب مهابة منصب القضاء-1

ترجمہ: لوگوں کی جرات وجسارت کے اندیشہ کی خاطر ذکر کردہ مسائل کے علاوہ اجتہادی نوعیت کے احکام میں تحکیم کے صحیح ہونے کا فتوی نہیں دیا جائے گا، برہان میں ہے کہ یہ اس لئے تاکہ منصبِ قضاء کی عظمت ختم نہ ہو جائے۔

ج: کمزور دینی حس رکھنے والے افراد کی جرأت بڑھ جائے گی اور وہ موقع بے موقع اسی طرح تحکیم کرنا شروع کریں گے۔

"شرح ادب القاضی" میں ہے:

قال الشـيخ الإمام شـمس الأئمة الحلواني رحمه الله، تخصـيص صـاحب الكتاب الحدود والقصـاص دليل على أن فيما سـوي ذلك ينفـذ حكم الحـاكم المحكم في المجتهـدات، نحو الكنـايـات[في الطلاق]، والطلاق المضـاف، وهو الظاهر عند أصـحابنا، وإليه أشـار بعد هذا، وهو الصـحيح، لكن مشـايخنا امتنعوا عن هذا في الفتوى وقالوا: يحتاج إلى حكم الحاكم كما في الحدود والقصـاص كيلاً يتجاسر العوام فيه.2

---

1 درر الحكام شرح غرر الأحكام: كتاب القضاء، ما تقضي فيه المرأة، ج2،ص411

2شرح «أدب القاضي للخصاف» للصدر الشهيد ت سرحان: الباب السادس والسبعون (في الخصمين يحكمان بينهما حكماً)، التحكيم في الحدود والقصاص، ج4،ص63

ترجمہ: امام شمس الائمہ حلوانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: صاحب کتاب کا حدود و قصاص کی تخصیص اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے علاوہ اجتہادی نوعیت کے مسائل جیسے طلاق کے باب میں کنایات اور طلاق معلق وغیرہ میں ظاہر مذہب یہ ہے کہ اس میں تحکیم نافذ ہو اور یہی بات صحیح بھی ہے لیکن مشائخ رحمہم اللہ نے اس پر فتویٰ دینے سے ممانعت فرمائی ہیں ، فرماتے ہیں کہ: اس میں بھی حدود و قصاص کی طرح قاضی کے فیصلے کی طرف احتیاج ہوتا ہے تاکہ کمزور دینی حس رکھنے والے افراد کی جرأت بڑھ نہ جائے۔

"ہدایہ" میں ہے:

"ولا يجوز التحكيم في الحدود والقصاص" ..قالوا: وتخصيص الحدود والقصاص يدل على جواز التحكيم في سائر المجتهدات كالطلاق والنكاح وغيرهما، وهو صحيح إلا أنه لا يفتى به، ويقال يحتاج إلى حكم المولى دفعا لتجاسر العوام-1

ترجمہ: حدود و قصاص میں تحکیم جائز نہیں ہے۔۔۔ مشائخ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ: حدود و قصاص کی تخصیص اس بات کی دلیل ہے کہ اجتہادی نوعیت کے تمام مسائل جیسے طلاق، نکاح وغیرہ میں تحکیم جائز ہو اور یہی بات قوی ہے مگر اس پر فتویٰ نہیں دیا جائے گا اور کمزور دینی حس رکھنے والے افراد کی جرأت دفع کرنے کے لئے کہا جاتا ہے کہ ان میں قاضی کے فیصلے کی طرف احتیاج ہوتا ہے۔

"معین الحکام" میں ہے:

[1] الهداية في شرح بداية المبتدي :كتاب أدب القاضي، باب التحكيم، ج3،ص108

وينفذ حكم المحكم في سائر المجتهدات نحو الكنايات والطلاق والعتاق وهو الصحيح، لكن شيوخ المذهب امتنعوا عن الفتوى بهذا لئلا يتجاسر العوام فيه.[1]

ترجمہ: تمام اجتہادی نوعیت کے مسائل جیسے طلاق کے باب میں کنایات اور عتق میں ثالث کا فیصلہ نافذ ہو اور یہی بات صحیح بھی ہے لیکن مشائخ رحمہم اللہ اس پر فتوی دینے سے ممانعت فرمائی ہیں، تاکہ عوام اس میں جرات وجسارت نہ کرے۔

یاد رہے کہ یہاں لوگوں کی جس جرأت وجسارت کے اندیشہ کی خاطر اجتہادی نوعیت کے مسائل میں تحکیم کی کھلی اور صاف اجازت دینے کی ممانعت کی گئی ہے، اس سے وہی جرأت مراد ہے جو اوپر تحریر کی گئی ہے کہ اس کی وجہ سے تقلید شخصی اور اس سے وابستہ مصالح کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ علامہ بابرتی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں؛

قال شمس الأئمة الحلواني: مسألة حكم المحكم تعلم ولا يفتى بها، وكان يقول: ظاهر المذهب أنه يجوز إلا أن الإمام الأستاذ أبا علي النسفي كان يقول: يكتم هذا الفصل ولا يفتى به كي لا يتطرق الجهال إلى ذلك فيؤدي إلى هدم مذهبنا[2]

ترجمہ: شمس الائمہ علامہ حلوانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ثالث کے فیصلے کا مسئلہ معلوم ہے لیکن اس پر فتوی نہیں دیا جائے گا، اور وہ فرماتے تھے کہ ظاہر مذہب میں یہ جائز ہے، مگر حضرت امام ابو علی النسفی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ یہ فصل چھپائی جاتی ہے اور اس پر فتوی نہیں دیا جائے گا۔

---

[1] معين الحكام فيما يتردد بين الخصمين من الأحكام: فصل فيما يصح فيه حكم المحكم وما لا يصح، الباب الخامس في أركان القضاء، ص25

[2] العناية شرح الهداية :كتاب أدب القاضي، باب التحكيم ، ج7، ص318

محقّق علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وفي الذخيرة: فيمن تزوج امرأة بغير ولي فطلقها ثلاثا فبعث القاضي إلى شافعي ليحكم بينهما ببطلان ذلك النكاح وببطلان الثلاث يجوز، وكذا لو حكما بذلك حكما يجوز، ولا يفتى به لما مر: يعني ما قدمه من خشية تجاسر العوام: يعني على هدم المذهب...[1]

ترجمہ: "ذخیرہ" میں اس شخص کے بارے میں ہے جو کسی عورت سے اس کے ولی کے بغیر نکاح کرے، پھر اسے تین طلاق دے، پھر قاضی اس کو شافعی المسلک قاضی کے طرف بھیجے تاکہ وہ ان دونوں کے مابین اس نکاح اور ان تین طلاقوں کے باطل ہونے کا فیصلہ کرے تو یہ جائز ہے، اور اسی طرح اگر ان دونوں نے اس مسئلہ میں کسی کو حکم بنایا تو یہ بھی جائز ہے لیکن عوام کا مذہب کے منہدم کرنے پر جرأت وجسارت کی وجہ سے اس پر فتویٰ نہیں دیا جائے گا۔

بعض مسائل میں فتویٰ نہ دینے کا مطلب

سابقہ عبارات میں جو یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ دلیل کے لحاظ سے تو تحکیم تمام مسائل میں درست اور معتبر ہے لیکن اجتہادی مسائل میں اس کے درست ہونے کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا، اس نوعیت کے دیگر بھی متعدد مسائل ہیں جن کے بارے میں حضرات فقہاء کرام یہی ارشاد فرماتے ہیں۔ بعض حضرات نے اس کا مطلب یہ سمجھ لیا ہے کہ زبانی طور پر تو اصل مسئلہ بتادیا جائے گا لیکن تحریری فتویٰ نہ دیا جائے۔ حالانکہ یہ مفہوم اس عبارت کے اصل منشا کے خلاف ہے، جس "عوامی جسارت وجرأت" سے بچنے کی خاطر یہ

[1] فتح القدير : كتاب أدب القاضي، باب التحكيم ج7، ص319

تعبیر استعمال کی جاتی ہے،وہ زبانی فتوی کی شکل میں بھی واقع ہو جاتا ہے،اس لئے یہ مفہوم لینا بالکل درست نہیں ہے۔اس کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نہ زبانی طور پر اصل حکم بتایا جائے اور نہ ہی تحریری طور پر لکھا جائے بلکہ بلاضرورت تو حکم بیان ہی نہ کیا جائے،اور اگر کہیں اس کی نوبت آجائے تو دینی مصالح کے پیش نظر اس پہلو کا جواب دیا جائے جس کے نتیجے میں ایسی جرأت وجسارت پیدا نہ ہو۔"بحر"میں ہے:

وفي السراج الوهاج إلا أن أصحابنا امتنعوا من هذه الفتوى وقالوا لا بد فيها من حكم المولى كالحدود كي لا يتجاسر العوام. اهـــ.واعلم أن معنى قولهم لا يفتى به لا يكتب على الفتوى ولا يجاب باللسان بالحل وإنما يسكت المفتي كما أفاده في الفتاوى الصغرى بقوله نكتم هذا الفصل ولا نفتي به وظاهر الهداية أن معناه أن المفتي يجيب بقوله لا يحل فليتأمل فيه -1

ترجمہ:" سراج الوہاج"میں ہے مگر یہ کہ ہمارے احباب نے اس پر فتوی دینے سے ممانعت فرمائی ہیں اور فرماتے ہیں:اس میں حدود کی طرح قاضی کا فیصلہ ضروری ہے تا کہ عوام جسارت نہ کرے،جان لو! کہ فقہاء کے قول"لَا يُفْتَى بِهِ" کا معنی یہ کہ فتوی کے طور پر اس کو نہیں لکھا جائے گا اور نہ اس کے حلال ہونے کے بارے میں زبان سے جواب دیا جائے گا،بلکہ مفتی خاموشی اختیار کرے گا،جیسا کہ"فتاوی صغری"میں مصنف نے اپنے اس قول کے ساتھ اس بات کا فائدہ دیا ہے کہ ہم اس فصل کو چھپائیں گے اور اس پر فتوی نہیں دیں

---

[1] البحر الرائق: كتاب القضاء،باب التحكيم، ج7،ص26

گےاور ہدایہ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ حلال نہیں ہے کہ مفتی اپنے قول سے جواب دے۔

تعزیر بالمال کی بنیاد پر فیصلہ کرنا

جرگہ اور مجلس تحکیم بہت سے قضایا میں تعزیر بالمال (مالی جرمانہ) کی بنیاد پر فیصلہ کرتے ہیں، مثال کے طور پر بعض نزاعات میں جس فریق کی ظلم وزیادتی واضح ہو جاتی ہے، اس کے بعض املاک کو ضائع کر دیا جاتا ہے، یا دوسرے فریق کو دلوایا جاتا ہے، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ زیادتی کرنے والے فریق کے ذمہ کچھ بھیڑ بکری وغیرہ ذبح کرنے اور لوگوں کو کھلانے کو ضروری قرار دیا جاتا ہے۔سوال یہ ہے کہ ایسے فیصلوں کی شرعی حیثیت کیا ہو گی؟ کیا ثالث لوگوں کے ایسے فیصلے بھی نافذ ہوں گے یا نہیں؟

بظاہر تو یہ دونوں صورتیں تعزیر بالمال کی ہے جو عام حالات میں درست نہیں ہے البتہ کہیں کوئی ایسی مجبوری پیش آجائے کہ کسی ضروری مصلحت کا حاصل کرنا اس پر موقوف ہو تو ایسی صورت میں بہت سے اہلِ علم کے نزدیک اس کی گنجائش دیدی جاتی ہے، بہت سے اہل علم نے تحکیم کی ان جیسے فیصلوں کا بھی یہی حکم بیان فرمایا ہے۔

تاہم غور کیا جائے تو مجلس تحکیم فریقین کے دئے ہوئے اختیار کے مطابق ہی کوئی فیصلہ یا تصرف کر سکتے ہیں، اب اگر فریقین نے صراحت کے ساتھ یا دلالۃ اس بات کا بھی اختیار دیا تھا تو اس کے بعد بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے درست ہونے میں تردد کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ خود تعزیز بالمال کے ناجائز ہونے کی بنیادی وجہ یہی بتائی جاتی ہے کہ اس میں کسی کا مال اس کی اجازت کے بغیر لے لیا جاتا ہے، اور یہ وجہ درج بالا صورت میں موجود نہیں ہے۔

ثالث کا فیصلہ عدالت میں پیش ہو جائے

پہلے ذکر کیا گیا تھا کہ ثالث کا فیصلہ اور باقاعدہ سرکاری قاضی کا فیصلہ یکساں نہیں ہے بلکہ دونوں میں کئی لحاظ سے فرق ہیں، ان ہی میں سے ایک فرق یہ بھی ہے کہ اگر کسی قاضی کا فیصلہ دوسری عدالت میں پیش ہو جائے تو اس دوسری عدالت کی بھی ذمہ داری ہے کہ اس کو نافذ ہی رہنے دے اگر چہ ان کا اپنا فقہی یا اجتہادی موقف اس فیصلہ کے متقضی کے خلاف بھی ہو، اس کی بجائے اگر ثالث کا کیا ہوا فیصلہ اگر کسی عدالت میں پیش ہو جائے تو اس کو اس قدر تقدس حاصل نہیں ہو گا بلکہ اگر قاضی کی رائے میں وہ فیصلہ درست اور شرعی تعلیمات کے مطابق ہو تو نافذ کرے ورنہ رد کرے۔ دونوں کے درمیان اس فرق کی بنیادی وجہ وہی ہے کہ سرکاری قاضی کی ولایت واختیار ثالث کے اختیار سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

"تبیین" میں ہے:

(وأمضى_ القاضي حكمه إن وافق مذهبه) .. (وإلا أبطله) أي إن لم يوافق مذهبه أبطله؛ لأن حكمه لا يلزمه لعدم التحكيم من جهته بخلاف ما إذا رفع إليه حكم حاكم حيث لا يبطله، وإن خالف مذهبه إلا أن يخالف الكتاب أو السنة أو الإجماع-1

ترجمہ: قاضی کی رائے میں ثالث کا فیصلہ درست اور مذہب کے مطابق ہو تو نافذ کرے ورنہ رد کرے؛ اس لئے کہ سر کار کی طرف سے ولایت نہ ہونے کی وجہ سے اس کا فیصلہ لزوم کا

[1] تبيين الحقائق :كتاب القضاء باب مسائل شتى ج4،ص193

درجہ نہیں رکھتا اس کا حکم قاضی کے حکم سے مختلف ہے اس لئے کہ قاضی کا فیصلہ اگر کتاب اللہ، سنت یا اجماع کے مخالف نہ ہو تو باطل نہیں ہو گا اگر چہ اس کے مذہب کے مخالف ہو۔

"مجلہ" میں ہے:

المادة (1849) إذا عرض حكم المحكم على القاضي المنصوب من قبل السلطان فإذا كان موافقا للأصول صدقه وإلا نقضه.[1]

ترجمہ: ثالث کا کیا ہوا فیصلہ اگر سرکاری قاضی پر پیش کیا جائے پس اگر قاضی کی رائے میں وہ فیصلہ درست اور شرعی تعلیمات کے مطابق ہو تو اس کی تصدیق کرے ورنہ رد کرے۔

ثالث کے لئے تحفہ اور ضیافت قبول کرنے کا حکم

قاضی کے بارے میں تو یہ بات تقریبا تمام فقہی مصادر میں مذکور ہے کہ وہ فریقین میں سے کسی سے ہدیہ وصول کرسکتا ہے اور نہ ہی ان میں سے کسی کی ضیافت یا خصوصی دعوت قبول کرسکتا ہے، لیکن کیا حکم اور ثالث کا بھی یہی حکم ہے یا اس مسئلہ میں اس کا حکم باقاعدہ قاضی کے حکم سے مختلف ہے؟ وہ اگر کسی خصم کی دعوت یا ہدیہ قبول کرنا چاہتا ہے تو کرسکتا ہے یا نہیں؟

اس میں بعض اہلِ علم کی رائے تو یہ ہے کہ ثالث کے لئے ان چیزوں کے وصول کرنے کی بہر حال گنجائش ہے، اگر کسی فریق کو اس کی وجہ سے اندیشہ پیدا ہو جائے کہ شاید ثالث فیصلہ کرتے وقت انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھ سکے گا تو اس کو اختیار ہے کہ فیصلہ کرنے سے پہلے ثالث کو معزول کرے۔ صاحب بحر کی رائے یہ ہے کہ فیصلہ

[1] مجلة الأحكام العدلية: الكتاب السادس عشر: في القضاء ،الباب الرابع: في بيان المسائل المتعلقة بالتحكيم،ص376

کرنے سے پہلے تو اس کا حکم بھی قاضی کی طرح ہونا چاہئے اور جس طرح قاضی کے لئے ان چیزوں کا قبول کرنا درست نہیں ہے یوں ہی حکم کے لئے بھی ایسا ہی ہونا چاہئے لیکن فیصلہ کر چکنے کے بعد چاہے تو وصول کرسکتا ہے۔ "بحر "میں ہے:

وينبغي أن لا يلي المحكم الحبس ولم أره وكذا لم أر حكم قبوله الهداية وإجابة الدعوة وينبغي أن يجوزا له لانتهاء التحكيم بالفراغ إلا أن يهدي إليه وقته من أحدهما فينبغي أن لا يجوز[1]

ترجمہ: یہ حکم کہ مناسب یہ ہے کہ ثالث کو قید کرنے کا اختیار نہ ہو اور اسی طرح ثالث کے ہدیہ اور دعوت قبول کرنے کا حکم میں نہیں دیکھا اور مناسب یہ ہے کہ فریقین میں اگر کسی ایک نے اس کو ہدیہ دے دیا فیصلہ کے وقت تو اس کے لئے ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں ہے، ہاں! گر متخاصم نے اس کو ہدیہ دے دیا فیصلہ کر چکنے کے بعد چاہے تو ہدیہ قبول کرسکتا ہے۔

"درمختار "میں ہے:

وكذا لم أر حكم قبوله الهدية وينبغي أن تجوز إن أهدى إليه وقت التحكيم.

ترجمہ: اور اسی طرح ثالث کے ہدیہ قبول کرنے کا حکم میں نے نہیں دیکھا اور لائق یہ ہے کہ اگر متخاصم نے اس کو ہدیہ دے دیا تحکیم کے وقت تو اس کے لئے ہدیہ قبول کرنا جائز ہے۔

وفي ردّ المحتار تحته: (قوله وكذا إلخ) هذا من البحر أيضا حيث قال: وكذا لم أر حكم قبول الهداية وإجابة الدعوة، وينبغي أن يجوزا له لانتهاء التحكيم بالفراغ إلا أن يهدى إليه وقته من أحدهما

[1] البحر الرائق: كتاب القضاء ، باب التحكيم ،حكم المحكم لأبويه وولده، ج7،ص28

فينبغي أن لا يجوز اهـ وذكر الرحمتي أن الذي ينبغي الجواز لأن من ارتاب فيه له عزله قبل الحكم بخلاف القاضي اهـــ وفيه نظر والله سبحانه أعلم.[1]

ترجمہ: مذکورہ بات "بحر" سے بھی نقل کی گئی ہے، صاحب بحر فرماتے ہیں کہ: اور اسی طرح ثالث کے ہدیہ اور دعوت قبول کرنے کا حکم میں نہیں دیکھا اور لائق یہ ہے کہ متخاصمین میں اگر کسی ایک نے اس کو ہدیہ دے دیا فیصلہ کے وقت تو اس کے لئے ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں ہے، ہاں! گر متخاصم نے اس کو ہدیہ دے دیا فیصلہ کر چکنے کے بعد چاہے تو ہدیہ قبول کرسکتا ہے۔ اور "رحمتی" نے ذکر کیا ہے کہ جواز ہی مناسب ہے؛ اس لئے کہ کسی فریق کو اس کی وجہ سے شک پیدا ہو جائے تو اس کو اختیار ہے کہ فیصلہ کرنے سے پہلے ثالث کو معزول کرے بخلاف قاضی کے۔

اس میں بظاہر صاحب بحر کی بات ہی زیادہ قابل عمل معلوم ہوتی ہے جیسا کہ علامہ شامی کی عبارت سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے۔ نیز اس رائے کے مطابق ثالث کے لئے فیصلہ کر چکنے کے بعد ہدیہ وضیافت قبول کرنے کی اجازت دی گئی ہے، لیکن ثالث کے لئے بہر حال مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس گنجائش سے بھی اسی صورت میں فائدہ اٹھائے جبکہ :

الف: وہ مستقل ثالث کی حیثیت سے معروف نہ ہو۔

ب: اور اس طرح گنجائش پر عمل کرنے کی صورت میں کسی دینی مفسدہ کا اندیشہ غالب نہ ہو۔

---

[1] الدر المختار وحاشية ابن عابدين: كتاب القضاء، باب التحكيم، باب كتاب القاضي إلى القاضي، ج5،ص432

فصل دوم: تحکیم کے تصور و تصدیق سے متعلقہ اشکالات وشبہات کا جائزہ

پہلا اشکال: اسلامی ملک میں اس کی ضرورت کیا ہے؟

اسلامی ملک میں اسلامی عدالتیں قائم ہیں تو ان کے ہوتے ہوئے تحکیم پر زور دینے کی آخر کیا ضرورت ہے؟ اگر یہی مقصود ہے کہ لوگوں کے نزاعات کا اچھی طرح تصفیہ ہو جایا کرے تو یہ مقصود تو ملک میں قائم عدالتوں کے ذریعے حاصل ہو جاتا ہے تو اس کے بعد تحکیم کی اہمیت اور اس کی ضرورت کیا باقی رہ سکتی ہے؟

جواب

بلاشبہ یہ ملک اسلامی تعلیمات کو نافذ کرنے کے لئے اسلامی نعرے پر بنایا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا بہت ہی شکر ہے کہ بہت سی کمزوریوں کے اعتراف کے باوجود اب بھی دنیا جہاں کے ممالک کی بنسبت اس میں متعدد دینی خصوصیات موجود ہیں۔

لیکن بنیادی نکتے کی بات یہی ہے کہ عدالتوں میں رائج نظام اسلامی تقاضوں کے مطابق ہے یا نہیں؟ عدالتی نظام سے جو شرعی مقاصد واہداف وابستہ ہیں، وہ ان عدالتوں سے حاصل ہو جاتے ہیں یا نہیں؟ یاد رہے کہ صرف لوگوں کے نزاعات کا نمٹانا ہی شریعت کا حکم نہیں ہے بلکہ اس کا ہدف یہ ہے کہ لوگوں کے نزاعات کو شریعت کے متعین کردہ احکام وضوابط کے تحت ہی نمٹایا جائے اور یہ ہدف ہماری رائج عدالتوں سے پوری طرح حاصل نہیں ہو پاتا جس کی چند وجوہات درج ذیل ہیں:

الف: انصاف حاصل کرنے کا راستہ سستا نہیں ہے بلکہ اکثر اوقات کثیر زر خرچ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے جو متوسط آدمی کی استطاعت سے باہر ہوتا ہے۔

ب:انصاف حاصل کرنے کا راستہ لمبا ہے، جلدی اور بروقت فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ اس میں بہت کچھ دیر لگتی ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ عدالتوں کے ذریعے وہی انصاف حاصل کرسکتا ہے جو صبر ِ ایوب (ﷺ)، عمرِ نوح (ﷺ) اور خزانہ قارون رکھتا ہو۔

ج: ہماری آئین میں الحمد للہ بہت سے اسلامی شقیں موجود ہیں لیکن بدقسمتی سے اس کے باوجود بہت سے قوانین خلاف شرع ہیں اور عدالتیں قانون کے مطابق ہی کاروائی کرنے اور فیصلہ کرنے کے پابند ہوتے ہیں۔

د:انصاف تک پہنچنے کا راستہ اور طریقِ کار بھی خالص اسلامی نہیں ہے بلکہ عام طور پر اس میں بھی متعدد خلافِ شرع امور کا ارتکاب کرنا ہی پڑتا ہے۔

دوسرا اشکال: قوت نافذہ کے بغیر تحکیم کا کیا فائدہ ہے؟

دوسرا شبہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ حکم یا مجلس تحکیم کے پاس تو قوت نافذہ ہوتا نہیں ہے کہ فریقین کو فیصلہ ماننے اور اس کے مطابق کاروائی کرنے پر مجبور کرے، اور اس کے بغیر لوگ اپنے مفاد کے خلاف فیصلہ قبول نہیں کرتے۔ عدالتوں میں تو یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی فریق فیصلہ ہوجانے کے بعد اس پر عمل کے لئے تیار نہیں ہوتا تو دوسرا فریق عدالت کے ذریعے اور عدالت اپنے فوج و پولیس وغیرہ کے ذریعے اس کو فیصلہ کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کرسکتا ہے اور اسی لئے عدالتی فیصلے کی بڑی اہمیت سمجھی جاتی ہے لیکن مجلس تحکیم تو اس طرح قوت سے محروم ہوتا ہے۔ اب اگر تحکیم کی ضرورت پر اصرار کرکے اس کا انتظام بھی کردیا جائے تو بھی اس کا کیا فائدہ متصور ہوسکتا ہے؟

جواب:

یہ بات بلاشبہ درست ہے اور عدالتی فیصلوں اور مجالس تحکیم کے فیصلوں کے درمیان یہ اساسی نوعیت کافرق موجود ہے لیکن اس کے باوجود تحکیم کی اہمیت ختم نہیں ہوتی جس کی چند وجوہات درج ذیل ہیں:

الف: فیصلہ ماننے کے لئے قوت نافذہ کا موجود ہونا ہر جگہ ضروری نہیں ہوتا، دوسرے الفاظ میں یہ کہئے کہ قوت نافذہ صرف فوج و پولیس ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس کی ضرورت تو وہیں پیش آتی ہے جب فریقین ضدی اور سرکش ہوں، کہ از خود حق دار کا حق دینے پر آمادہ نہ ہوتے ہوں جب تک کہ فوج و پولیس کے ذریعے ان کو مجبور نہ کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ معاشرے کے تمام افراد ایسے نہیں ہیں، بہت سے لوگوں کے لئے ان کا دینی حس، خوفِ آخرت اور اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی قوت نافذہ کی حیثیت رکھتی ہے جس کی وجہ سے ان کلیہ حال ہوتا ہے کہ اگر ان کو معلوم ہو جائے کہ میرے ذمہ کسی کا حق بنتا ہے تو وہ از خود دینے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ خدا کے خوف سے تو اس پر آمادہ نہیں ہوتے لیکن دیگر عناصر کی وجہ سے فیصلہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ خواہ معاشرے میں کم ہو یا زیادہ، لیکن بہر حال ان کی حد تک تو کسی ایسے نظام تحکیم کا انتظام کرنا ضروری ہے جو شرعی تقاضوں پر پورا اترتا ہو۔ [1]

---

[1] اُس کام کے لئے ہم نے مختلف جگہوں کے دورے کئے جہاں تحکیم کا نظم کسی نہ کسی شکل میں موجود تھا، اپنے معلومات میں اضافے کے لئے ان سے کچھ گفت و شنید ہوئی۔ زیر بحث سوال کے جواب میں ان کے تاثرات امید افزا اور کافی حد تک اطمینان بخش معلوم ہوئے، اس کا حاصل یہ تھا کہ گو ایسے واقعات بھی سامنے آجاتے ہیں کہ بعض لوگ فیصلہ کروانے کے باوجود بھی ضد و نفسانیت وغیرہ عوامل کی وجہ سے اس کے ماننے اور اس کے مطابق عمل کرنے سے انکاری ہوتے ہیں، لیکن اکثریت ایسی نہیں ہے، اکثر فیصلے روبہ عمل لائے جاتے ہیں۔

ب: ہر شخص اپنی استطاعت کی حد تک کا ہی مکلف ہے اور ہماری استطاعت یہی ہے کہ دینی و شرعی تقاضوں کے مطابق کوئی مناسب و معقول نظم قائم کرلیں، لوگوں کا عملی طور پر اس کو تسلیم کرنا اور اس کے مطابق عمل درآمد کرنا ایک ایسا کام ہے جو ہمارے دائرہ اختیار سے باہر ہے، ہم اس کے لئے صرف وعظ و نصیحت ہی کرسکتے ہیں۔ اب یہ بات کیونکر مناسب ہوسکتی ہے کہ ایک ایسی بات کے لئے جس کے ہم پابند ہی نہ ہوں، ہم اپنی استطاعت و قدرت کی حد تک ایک اہم دینی خدمت انجام دینے کو ہی سلام کرلیں!

ج: خدمت دین کے تمام وہ شعبے جن کا تعلق عام افراد کے ساتھ ہوتا ہے، ان کا قریب قریب یہی حال ہے، مثال کے طور پر جمعہ وغیرہ اجتماعات کے موقع پر وعظ و نصیحت کا کام ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ہے، افتاء کی خدمت ہے وغیرہ وغیرہ۔ بلاشبہ یہ سب اہم دینی خدمات ہیں لیکن ان میں بھی کسی نہ کسی درجہ میں وہی خطرہ موجود ہے کہ لوگ نہیں مانیں گے اور یہ نِرا خطرہ ہی نہیں بلکہ آئے دن اس کا مشاہدہ بھی ہوتا رہتا ہے لیکن اس کے باوجود محض اس بنیاد پر ہم یہ خدمات چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

تیسرا اشکال: دار الافتاء کے باوجود تحکیم کی ضرورت کیوں؟

جب ملک کے کونے کونے میں دار الافتاء موجود ہے اور وہاں سے لوگوں کے دینی مسائل کا حل نکالا جاتا ہے تو اس کے ہوتے ہوئے تحکیم کی ضرورت کیا ہے؟ دار الافتاء کا نظم اس مقصد کے لئے کافی ہے اور وہیں سے وہ ساری ضرورتیں پوری ہوجاتی ہیں جن کے لئے مجلس تحکیم کی اہمیت پر زور دیا جاتا ہے!

جواب

تحکیم کوئی الگ شعبہ نہیں ہے بلکہ وسیع معنیٰ میں دار الافتاء ہی کا ایک ذیلی کام ہے۔بعض مسائل تو فتویٰ کی ترتیب اور فتویٰ کی زبان سے ہی حل ہو جاتے ہیں لیکن مسائل کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس میں فتویٰ زیادہ مفید و مؤثر ثابت نہیں ہوتا، وہاں باقاعدہ فریقین کا موقف سننے اور پھر اس کے نتیجے میں کوئی فیصلہ کن بات کی ضرورت پیش آتی ہے، اس کے بغیر مقصود حاصل نہیں ہوتا اور باہم تنازع ختم نہیں ہوتا۔اسی کو تحکیم کہا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر دار الافتاؤں میں آئے دن اس نوعیت کے سوال آتے ہیں کہ طلاق کے معاملہ میں میاں بیوی کا اختلاف ہے، میاں دعوی کرتا ہے کہ میں نے کوئی طلاق نہیں دی یا تین سے کم طلاقیں دی ہیں جبکہ بیوی دعویٰ کرتی ہے کہ شوہر نے مجھے پورے تین طلاقیں ہی دی ہیں، دارالافتاء سے یہی جواب صادر ہوتا ہے کہ پہلے بیوی اپنے دعویٰ پر گواہ پیش کرے، اگر نہ ہو تو شوہر اپنی بات پر قسم اٹھائے تو اس کی بات ثابت ہو جائے گی، البتہ چونکہ عورت قاضی کی طرح ہے لہٰذا اگر اس نے اپنے کانوں سے طلاق کے الفاظ سنے ہوں یا قابل اعتماد لوگوں کی زبانی اس کو اطلاع ملی ہو کہ شوہر نے تین طلاقیں دی ہیں تو ان دونوں صورتوں میں وہ بہر حال اپنے آپ کو طلاق یافتہ ہی تصور کرلے اور شوہر کو کسی طرح اپنے اوپر قابو نہ دے۔

اب فتوی کی حد تک تو یہ بات درست ہے اور ظاہر ہے کہ فتوی دینے والا یہی فتوی دے سکتا ہے، لیکن اگر اس جیسی صورت میں شوہر اور بیوی ایک ہی دار الافتاء کے پاس الگ الگ آئے اور فتوی وصول کرلے اور پھر دونوں اس فتوی کے مطابق عمل بھی کرنا چاہے تو کیونکر کر سکتے ہیں؟ اور اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ شوہر قسم کھا کر اس کو اپنے پاس رہنے اور

قابو دینے پر مجبور کرے گا جبکہ بیوی اس سے انکار کرے گی، ظاہر ہے کہ اس سے معاملہ میں تناؤ پیدا ہو گا۔

اب عدالتی چارہ جوئی یا تحکیم کے بغیر اس کا کوئی مناسب حل نہیں ہے، عدالتی چارہ جوئی تو مؤثر و مفید ہے لیکن دارالافتاء سے بلاضرورت اس کا مشورہ دینا کسی طرح مناسب نہیں ہے جس کی تفصیل پہلے ذکر کی گئی ہے۔

چوتھا اشکال: ریاستی ذمہ داری اپنے سر کیوں لے لی جائے؟

مجلس تحکیم کے حوالہ سے ایک اشکال یہ بھی ہے کہ لوگوں کے نزاعات نمٹانا تو حکومتی ذمہ داری ہے، حکومت ہی کا فریضہ ہے کہ لوگوں کے معاملات کا درست نہج پر تصفیہ کرنے کے لئے کوئی مناسب نظم تشکیل دیدے اور وہ کسی نہ کسی درجے میں اس کو انجام بھی دے رہی ہے چنانچہ عدالتی نظام کا بنیادی مقصد یہی ہے، تو ایسے میں ہم کیوں یہ ذمہ داری اپنے سر لے لیں؟

جواب:

بلاشبہ صرف نزاعات ختم کرنا ہی نہیں بلکہ لوگوں کی دنیوی و دینی تمام اجتماعی ضروریات کے لئے انتظام کرنا اور اپنی استطاعت کی حد تک اس کے لئے مناسب مواقع فراہم کرنا حکومت وقت کی ذمہ داری ہے لیکن غور و فکر کی بات یہ ہے کہ اگر کہیں حکومت کسی خاص ضرورت کا سرے سے اہتمام کرنا ہی چھوڑتی ہے یا اہتمام کرتی تو ہے لیکن اس طریقے پر نہیں جو شریعت کا تقاضا ہے تو اس وقت رعایا کو کیا کرنا چاہئے؟ ایسی صورت حال میں کیا یہ رویّہ اختیار کرنا مناسب ہے کہ جب حکومت انتظام نہیں کرتی تو ہم کیوں

کریں؟ یا اپنی استطاعت کی حد تک کوشش شروع کر لینی چاہئے؟ ظاہر ہے کہ یہی دوسرا راستہ ہی قرین دانش و قیاس ہے۔

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ کسی بھی ملک میں مکمل اسلامی عدالتی نظام موجود نہیں ہے، تمام قوانین بھی اسلامی ہوں اور قانون کے مطابق انصاف کے حصول کا طریق کار بھی شرعی ہو،ایسی کوئی فضاء پوری دنیا میں موجود نہیں ہے۔ ہمارے ہاں وطن عزیز پاکستان کی عدالتی نظام بھی مکمل طور پر اسلامی ہے اور نہ ہی طریق کار درست ہے۔اس گھمبیر صورت حال میں جس طرح امامت، تدریس، افتاء وغیرہ تمام خدمات کو، باوجودیکہ یہ سب چیزیں اصلا اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہیں، کو اپنے سر لیتے ہیں اور اپنی استطاعت کی حد تک ان کے لئے انتظام کرتے ہیں، یوں ہی شرعی تقاضوں کے مطابق "حلِّ نزاعات" اور "فصلِ خصومات" بھی ایک اہم دینی ذمہ داری ہے جس سے غفلت برتنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

ختم شد

☆☆☆☆☆☆☆